TRANSFORMATION 2

خُودی کی تلاش
میں کون ہوں؟

ڈاکٹر محمد عمران یوسف

خُودی کی تلاش - میں کون ہوں؟

ڈاکٹر محمد عمران یوسف

DR.IMRAN YOUSUF

Philanthropist | Therapist | Consultant | Trainer | Diplomat

Sitara-e-Imtiaz

Mental Health Psychologist
www.drimranyousuf.com

Managing Director
JOFA Group

Consul General
a.h. Philippines

Founder
Transformation
International Society

- Awarded among the Top 100 CEOs of Pakistan
- Trained & Consulted 5000+ International Professionals
- Conducted seminars/workshops for 28 years on 4 continents for 100,000+ individuals
- Recipient of National Awards (Netherlands, Philippines, Canada & USA)
- Member, Canada, US, UK & Pakistan Psychological Associations & Clinical TMS Society, USA
- Canadian Citizen
- Master Trainer of NLP & Clinical Hypnotherapy, USA
- Developer of Abraq ® Healing System
- D.Litt. & PostDoc in Management Sciences & Psychology (UK)
- Renowned Celebrity with Global Recognition
- International & National Author & Writer

Authored

+92 300 0401225 | /drimranyousuf | /drimranyousuf | @DrImranYousuf | /DrImranYousuf

Fazlee's BOOKS

ISBN 978-969-441-342-6
9 789694 413426

WHO AM I?

Model developed by

Dr Imran M Yousuf

based on

Psychology,

Science &

Religion

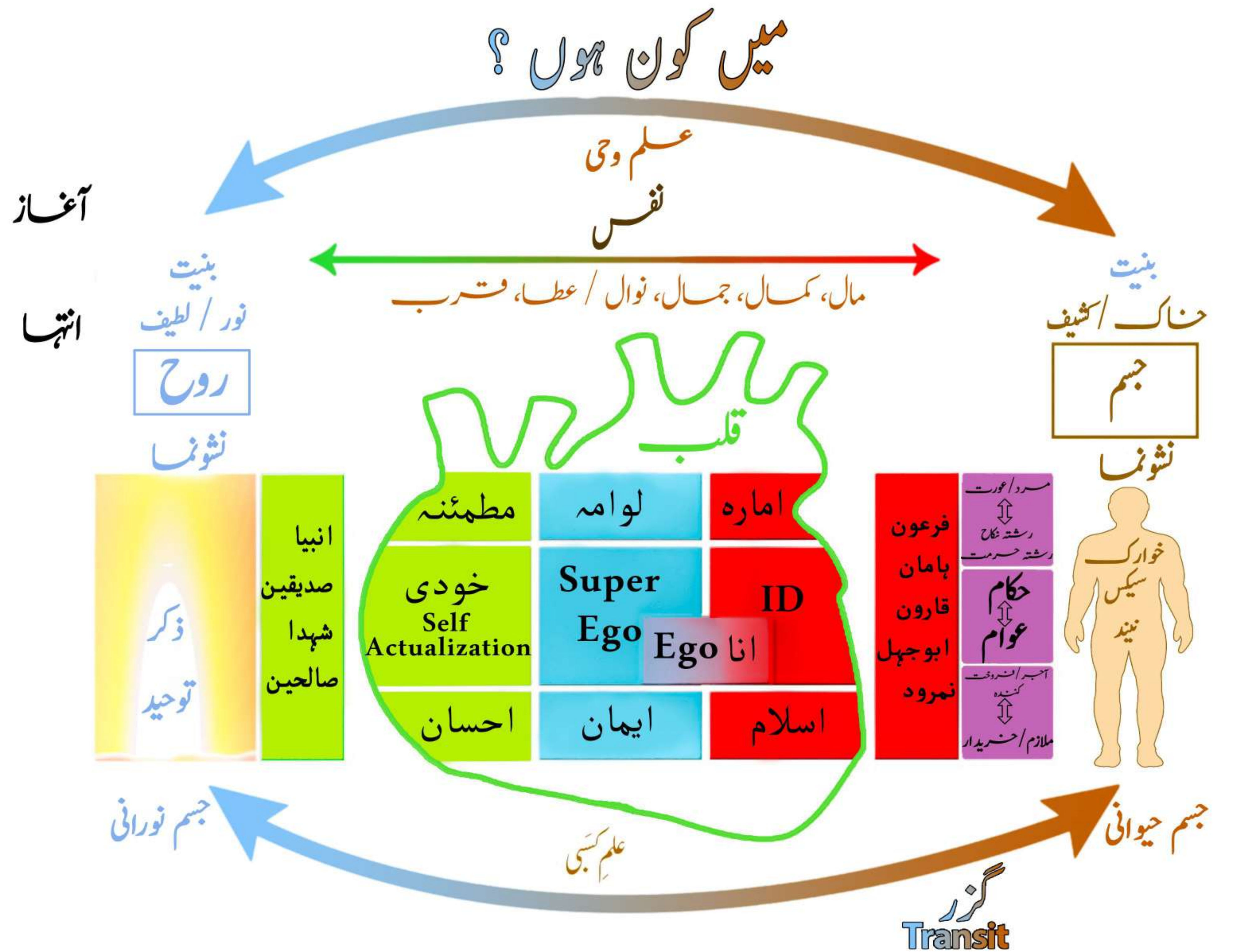
میں کون ہوں ؟
علم وحی
نفس
آغاز
انتہا
بنیت
نور / لطیف
روح
نشونما
بنیت
خاک / کثیف
جسم
نشونما
مال، کمال، جمال، نوال / عطا، قرب
قلب
ذکر
توحید
انبیا
صدیقین
شہدا
صالحین
مطمئنہ
خودی
Self
Actualization
احسان
لوامہ
Super
Ego
ایمان
امارہ
ID
Ego انا
اسلام
فرعون
ہامان
قارون
ابوجہل
نمرود
مرد / عورت
رشتہ نکاح
رشتہ حرمت
حکام
عوام
آجر / فروخت کنندہ
ملازم / خریدار
خوارک
سیکس
نیند
جسم نورانی
جسم حیوانی
علمِ کسبی
گزر
Transit

WHO AM I?

Model developed by

Dr Imran M Yousuf

based on

Psychology,

Science &

Religion

خُودی کی تلاش

میں کون ہوں؟

ڈاکٹر محمد عمران یوسف

سائیکولوجسٹ، ہپناتھیراپسٹ، بزنس کنسلٹنٹ

چیئرمین ٹرانسفارمیشن انٹرنیشنل سوسائٹی

جملہ حقوق بہ حق ''ٹرانسفارمیشن انٹرنیشنل سوسائٹی'' محفوظ ہیں

کتاب	میں کون ہوں؟
مولف	ڈاکٹر محمد عمران یوسف
پہلی اشاعت	دسمبر 2024ء
طابع	فضلی بک، اُردو بازار، کراچی
عطیہ	1000 روپے
ناشر	ٹرانسفارمیشن انٹرنیشنل سوسائٹی 5th فلور، جوفا ٹاور، یونیورسٹی روڈ، گلشن اقبال، کراچی
فون:	0322-3746726

transformation.com.pk

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	عرضِ مولف	9
2	قصے کا آغاز	21
3	روح کیا ہے؟	40
4	قرآن کی رُو سے زمین پر انسان کے ارتقائی مراحل	52
5	دو طرح ک قوانین	57
6	روحانی دنیا سے طبعی دنیا کو منتقلی	73
7	نفس کیا ہے؟	85
8	دو قسم کے لوگ	105
9	شخصی نمو اور تربیت کیلئے 7، اقدامات	115
10	دین کے تین مراتب	128

انتساب

اُن تمام افراد کے نام
جنھوں نے مجھے قرآن اور صاحب قرآن سے رُوشناس کرایا،
اور جن کا شکریہ میں زندگی بھر ادا نہیں کرسکتا؛
دعا گو ہوں کہ اللہ انھیں بہترین اجر سے نوازے، آمین

اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم
ٹرانسفارمیشن چلڈرن ریہیب سنٹر
کیلئے وقف ہے

مفتی تقی عثمانی صاحب کے کلمات

میں ڈاکٹر عمران یوسف کا انتہائی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس دقیق اور اہم موضوع پر اظہارِ رائے کا موقع فراہم کیا۔

جب عقل رک جائے اور الجھن دُور نہ ہو رہی ہو تو عقل مندی یہ ہے کہ قرآن سے رہ نمائی حاصل کی جائے۔ اللہ نے قرآن ہمیں ایسی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس میں ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے باوجود قرآن کریم کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں اور اس سے استفادہ حاصل نہیں کرتے، اور رہ نمائی کیلئے اس سے رجوع نہیں کرتے۔

ڈاکٹر عمران نے اپنی مغرب کی حاصل کردہ علم و دانش کو بکاؤ مال یا پیسہ کمانے کی بجائے ملک وقوم کی خدمت کیلئے وقف کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عمران امریکا چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ امریکا میں اُن کے کیریر کا بہترین ماحول موجود تھا، لیکن اللہ نے ان کے دل میں ڈالا کہ میں نے جو کچھ علم و فن سیکھا ہے، اس کو اپنے ملک واپس جا کر خدمت انجام دوں گا۔ یہ احساس اگر ہر تعلیم یافتہ شخص کے اندر پیدا ہو جائے کہ اللہ نے مجھے جو علم و صلاحیت عطا کی ہے، اس کو ملک و ملت کے مفاد کیلئے استعمال کروں گا تو اس فکر اور احساس کے ذریعے چراغ سے چراغ جلیں گے اور صبح روشن طلوع ہو گی۔

قابل ستائش ہیں وہ تمام کاوشیں جو ڈاکٹر عمران دین، نفسیات اور ملک و ملت کی اصلاح کیلئے انجام دے رہے ہیں۔

مولانا محمد آصف قاسمی صاحب کے کلمات

کسی بھی تحریک اور مقصد کو چلانے کیلئے بڑے دل گردہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ جس طرح ٹرانسفارمیشن کے مقصد کو دین میں ڈھال کر ڈاکٹر محمد عمران یوسف نے پیش کیا ہے، یہ انھی کا کمال ہے۔ اس میں انھیں کتنی دقتیں پیش آئیں، اس کا آپ کو شاید اندازہ نہیں۔ میں اس لیے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں ان کے کاموں کا گزشتہ 25 سال سے مشاہدہ کر رہا ہوں۔ جب بھی دین، نفسیات، سائنس، قرآن کے زیر سایہ پروگرام شروع کیا، آغاز مخالفتوں ہی سے ہوا۔ لیکن، جس طرح ڈاکٹر عمران اپنی علمی خدمات اور صلاحیتوں کو لے کر چل رہے ہیں، میں یہی کہوں گا کہ یہ دین کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں، بلکہ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وقت کا کوئی بڑا دینی عالم یہ خطاب اور تحریر کر رہا ہے۔

عرضِ مولف

یہ 1985 کی بات ہے، جب میری عمر سترہ برس تھی اور میں کراچی سے انٹرمیڈیٹ کر چکا تھا۔ اب میں اس شش و پنج میں تھا کہ آگے کیا پڑھا جائے۔ میں کمپیوٹر سائنس میں تعلیم حاصل کر چاہتا تھا۔ اُس وقت پاکستان میں کمپیوٹر سائنس کی تعلیم نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے مزید تعلیم کیلئے بھاگ دوڑ شروع کر دی اور کچھ ہی عرصے میں مجھے امریکا میں ایک چرچ کی زیرِ نگرانی چلنے والی یونیورسٹی سے اسکالرشپ مل گئی۔ یہاں یہ نکتہ اہم ہے کہ ایک مسلمان بچے کو عیسائی چرچ نے اسکالرشپ کیسے دے دی؟ اس پر میں اس چرچ کا آج بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

وہاں جا کر مجھے اندازہ ہی نہ ہوا کہ اسکالرشپ لینا جتنا مشکل ہے، اس سے کہیں زیادہ مشکل میرے لیے اس کورس کو آگے بڑھانا ہے، کیوں کہ میری پہلی ہی کلاس میں میرے استاد نے مجھ سے ایک سوال کرڈالا: Who is Yousuf? یعنی یوسف کون ہے؟ میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ استاد نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے آں حضرت ﷺ کے بارے میں انتہائی نازیبا کلمات کہے۔ یہ نازیبا کلمات میں نے ایک غیر مسلم ملک میں، ایک غیر مسلم کی زبان سے صرف سترہ برس کی عمر میں سنے۔

اللہ کے فضل سے ہمارا گھرانہ دین دار ہے۔ سات برس کی عمر ہی سے میں نے روزہ

رکھنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہوش کی عمر آنے کے بعد کبھی میرا روزہ چھوٹا ہو۔ اور چونکہ بڑی تیز رفتاری سے قرآن پڑھتا تھا تو سب سے زیادہ لڈو مجھے ملا کرتے تھے۔ لیکن، اس کے باوجود مجھے دین کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔ میں اسلامی رسوم پر تو عمل کرتا تھا، مگر اسلام کی تعلیمات اور احکام کی حکمت اور دانش سے ناواقف تھا۔

اس سفر کے دوران میں جہاں تھا اور آج جہاں ہوں، جن لوگوں نے مجھے آگے بڑھایا اور اعتماد دیا... ان میں شیخ احمد دیداتؒ، ڈاکٹر ذاکر نائک، بدیع الدین سہروردی (کینیڈا)، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور خاص کر 1995 سے مولانا آصف قاسمی صاحب کے نام نمایاں ہیں۔ ان لوگوں سے مجھے یہ بات جاننے میں مدد ملی کہ مجھے دین کامل عطا کیا گیا ہے اور وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

ان علمائے کرام کی تعلیمات اور صحبت نے میرے اندر قرآن فہمی کا شغف کوٹ کوٹ کر بھر دیا اور میں نے قرآن کا مطالعہ بڑی سنجیدگی سے شروع کر دیا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں امریکا / کینیڈا کے غیر اسلامی ماحول میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے باوجود میں قرآن کے پیغام سے قریب تو ہوتا گیا۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ کمپیوٹر سائنس کی اعلیٰ تعلیم اور قرآن کی لافانی تعلیمات نے مجھ پر علم اور معرفت کے نئے دروازے وا کیے۔ چنانچہ ایک زمانہ ایسا آیا کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد و محور ہی قرآن کو سمجھنے اور اس کا ابدی پیغام دنیا والوں تک ان کی فہم کی سطح کے مطابق پہنچانے کو بنالیا۔

علم کے دو ذرائع

انسان آج جو کچھ ہے، وہ اپنے علم کی بنیاد پر ہے۔ ''علم'' انسانی تاریخ میں قوموں کا سب سے بڑا اثاثہ رہا ہے اور آج اس کی اہمیت کئی چند ہوچکی ہے کہ ہم اس دَور کو Information Technology کا دَور کہتے ہیں۔

جب انسان غاروں میں رہتا تھا تو اس کا علم وہیں تک محدود تھا۔ جوں جوں علم بڑھا، اس کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور وہ نئی چیزیں دریافت کرتا چلا گیا۔حتیٰ کہ آج کے انسان کا سفر روئے زمین کی حدود سے نکل کر خلاؤں تک وسیع ہو گیا ہے۔

بنیادی طور پر، انسان کے پاس علم یا معلومات کے حصول کیلئے صرف 2 طریقے یا راستے ہیں:

اول علم لدنی یا علم کسبی یا Acquired Knowledge

دوم علم وہبی یا Divine Knowledge

اول علم لدنی یا علم کسبی یا Acquired Knowledge

یہ وہ علم ہے جو آدمی اپنی محنت و مشقت اور کوشش سے حاصل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، سائنس آج جس مقام پر ہے، وہ آج سے ہزار سال پہلے نہیں تھی۔ انسان نے اپنے اردگرد موجود مظاہر فطرت پر غور کیا، انھیں کھوجا، ان کے کام کا جائزہ لیا تو پھر جو کچھ جانا، ان کی مدد سے کچھ نئی راہیں تلاش کیں۔ یہ علم کسبی ہے۔ اسی طرح، ہم جس کرسی پر بیٹھتے ہیں، بستر پر لیٹتے ہیں، گاڑی میں سفر کرتے ہیں، کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہیں، یہ سب علم لدنی یا علم کسبی ہے۔ اسے انسان نے اپنی محنت اور جستجو سے حاصل کیا ہے۔ جو آدمی کسی فیلڈ میں جتنا زیادہ محنت کرے گا، اسے یہ معلومات اتنی زیادہ ملتی رہیں گی۔

ایسے علم پر یقین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا منبع (Source) دیکھا جائے۔ اگر آپ کے پاس کوئی معلومات پہنچتی ہے تو آپ یہ جانیں گے کہ یہ بات کسی نے کہی، کہاں لکھی ہوئی پڑھی۔ اگر یہ منبع علم مستند ہے تو اس معلومات کو تسلیم کیا جائے گا، ورنہ اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ مثال کے طور پر، گردوں کی صحت کے بارے میں اگر ڈاکٹر ادیب رضوی کوئی بات کہیں تو ہم اسے سنجیدگی سے لیں گے، کیونکہ ڈاکٹر رضوی عالمی معیار کے

گردوں کے امراض پر سند (اتھارٹی) مانے جاتے ہیں۔ اگر فزکس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان (مرحوم ومغفور) کوئی بات کرتے تو اس بارے میں ان کی ہر ہر بات کو علمی حلقوں میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی، کیونکہ وہ اس مقام پر فائز تھے جہاں فزکس کے بارے میں ان کی بات غیر مصدقہ نہیں ہو سکتی تھی۔

نیز، علم کسبی کیلئے اس شے کا ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ ٹیسٹ سے پتا چل جاتا ہے کہ فلاں معلومات درست ہے یا غلط۔

دوم علم وہبی یا Divine Knowledge

علمی وہبی وہ علم ہے جو انسان اپنی محنت و کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا، خواہ وہ کتنی ہی کوشش اور محنت کر لے۔ علم وہبی سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ علم ہے۔ ایسا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اللہ ہی کا انتخاب ہوتا ہے کہ وہ کسی کو علم وہبی کیلئے منتخب کرتا ہے۔

مثال کے طور پر، ہم انسانی جسم کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ جسم (Body)، ذہن (Mind) اور روح (Soul) کا مجموعہ ہے۔ گویا، انسانی جسم کے تین مرکزی پہلو ہیں۔ جہاں تک جسم کا تعلق ہے، ہم اس کے بارے میں میڈیکل سائنس کی مدد سے بڑی آسانی سے بہت کچھ جان سکتے ہیں (علم کسبی) اور بتا سکتے ہیں کہ یہ کس حالت میں ہے۔ ذہن سے متعلق علم مائنڈ سائنس اکیسویں صدی میں بہت ایڈوانس ہو چکا ہے کہ ایک سال کے بچے کی شخصیت کا جائزہ لے کر یہ بتانا ممکن ہے کہ وہ کیا ہے۔

معاملہ کچھ پیچیدہ ہوتا ہے انسان کے تیسرے پہلو یعنی ''روح'' کو سمجھنے کا، کیوں کہ ہم سب دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ابھی ہٹا کٹا چل پھر رہا ہے اور اچانک اسے دل کا دورہ پڑتا

ہے اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، یعنی فوت ہو جاتا ہے۔ بہ ظاہر، اس کا جسم بالکل ویسا ہی ہے جیسے کچھ دیر پہلے تھا۔ اس کا دماغ بھی موجود ہے۔لیکن، ہم کہتے ہیں کہ اب یہ ''زندہ نہیں'' رہا۔ اب اسے انسانوں کی دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم اسے دفنا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اس کی ''روح'' اس کے بدن میں موجود نہیں رہی۔

سوال یہ ہے کہ ہم اس روح کو کیسے جانیں اور کھوجیں۔ انسان سائنس میں انتہائی ترقی کرنے کے باوجود ابھی تک ''روح'' کے بارے میں رتی برابر نہیں جان سکا۔ کیونکہ روح وہ پہلو ہے جس کے بارے میں انسان علم کسبی کے ذریعے کچھ نہیں جان سکا اور مجھے کہنے دیجیے کہ آئندہ بھی نہیں جان سکے گا۔

روح کے بارے میں انسانی سوالات کے جوابات ہمیں ''علمی وہبی'' سے ملتے ہیں، یعنی وہ علم جو اللہ اپنے فضل سے کسی بندے کو عطا کرتا ہے۔

یہاں ایک بہت بڑا اور بہت اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم علم وہبی سے حاصل ہونے والی معلومات یا جوابات کے مستند یا غیر مستند ہونے کا فیصلہ کیسے کریں؟ کیونکہ سائنس میں تو ہم حواسِ خمسہ کی مدد سے تجربات اور ٹیسٹ کرتے ہیں اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کی بنیاد پر طے کرتے ہیں کہ فلاں معلومات درست ہے یا غلط ہے۔ لیکن، روح کے بارے میں ہمارے پاس حواسِ خمسہ سے اخذ کردہ ایسا کوئی ظاہری یا طبیعی معیار نہیں ہے۔

اس کیلئے ہمیں ایک ایسا منبع علم تلاش کرنا ہوگا جو مستند ہو۔ پھر یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ یہ منبع علم واقعی مستند ہے؟ فرض کیجیے، ایک شخص کھڑے ہو کر روح کے بارے میں کچھ کہہ دے تو ہم کس بنیاد پر یہ مانیں کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔

قرآن ہی مستند کیوں؟

ہم یہ دعوا کرتے ہیں کہ قرآن روح کے بارے میں جو کچھ بتا رہا ہے، وہ emparical based ہے۔تو یہاں دوبارہ یہ سوال کیا جائے گا کہ ہمارے پاس اس دعوے کا کیا ثبوت ہے؟ ہم کس وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ نہ میڈیکل سائنس اور نہ مائنڈ سائنس، صرف قرآن ہی روح کے بارے میں درست معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ ہمیں آج کے انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب دینا ہوگا۔ یہی علم کی شان ہے۔ ثبوت اور دلیل کے بغیر کوئی بات قابل قبول نہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن اپنے دلائل اور ثبوت کیلئے کافی ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ جب ہم کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو اس میں لکھی ہوئی باتوں کو تسلیم کرنے یا رَد کرنے کیلئے ہم اس کتاب میں دی گئی معلومات کو پرکھتے ہیں۔ اگر وہ معلومات حقائق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں تو ہم دیگر معلومات کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

کسی کتاب کے مستند ہونے یا ہونے کا یہی سائنسی معیار ہے۔

اول تو یہ کہ قرآن کریم جو آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے اتارا گیا، آج تک اس میں ایک حرف یا حرکت کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ بات ہم دنیا کی کسی بھی دوسری کتاب کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ یہ سائنسی اور تاریخی بنیادوں پر مصدقہ حقیقت ہے۔

دوم، ساڑھے چودہ سال بعد بھی ایک آدمی دنیا کے کسی خطے میں ہو، مشرق میں ہو یا مغرب میں، یورپ میں ہو یا ایشیا اور عرب میں، دنیا کی کوئی بھی زبان بولنے والا ہو، ہر نسل کا ہر انسان قرآن کی ایک ہی عبارت، ایک ہی ایڈیشن پڑھتا ہے۔ اور یہ ایڈیشن وہی ہے جو خاتم الانبیا حضرت محمد ﷺ پر آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے نازل کیا گیا تھا۔ کیا آپ اس قسم کی کسی دوسری کتاب کی ایک مثال بھی دے سکتے ہیں کہ وہ دنیا کے ہر خطے، ہر

زبان بولنے والے، ہر نسل سے تعلق رکھنے والے افراد میں سو فیصدی ایک ہی انداز سے پڑھی جاتی ہو۔

قرآن کے حق میں یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس کے مقابل آج تک کوئی دوسری کتاب پیش نہیں کی جاسکی ہے۔

سوم، پوری دنیا میں کسی بھی وقت ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ جب قرآن پڑھا نہ جارہا ہو۔ پوری دنیا میں کسی بھی دوسری کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ وثوق کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن، قرآن پورے خطہ ارض پر ہر وقت پڑھا جارہا ہے۔ کہیں مدارس میں طلبہ قرآن حفظ کررہے ہیں تو کہیں سورج کی گردش کے اعتبار سے پانچوں نمازوں کے اوقات بدل رہے ہیں اور وہاں موجود مسلمان نمازوں میں مسلسل قرآن کی تلاوت کررہے ہیں۔

چہارم، قرآن میں جگہ جگہ نشانیاں ہیں۔ قرآن ہی کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے جتنی نشانیاں (Signs) بتائیں، وہ حرف بہ حرف درست ثابت (Science) ہوئیں۔ گویا، اس کتاب میں Signs بھی ہیں اور Science بھی ہے۔

سائنس کا ایک اصول ہے کہ جو چیز 95 فیصد درست ہے، تو وہ سو فیصدی درست ہے۔ پانچ فیصد سے کم فرق (>5% margin) کو انسانی خطا (Human intervention) سے متعلق قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا، یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ قرآن پاک میں جو نشانیاں (Signs) کی گئیں اور جو فطری حقائق (Science) بیان کیے گئے، وہ سو فیصدی درست ثابت ہوئے۔ ان چیزوں میں صفر کا فرق (>0% margin) ہے۔

نیز، جہاں سائنس کسی بات کو سمجھنے یا ثابت یا رد کرنے سے قاصر ہوتی ہے تو وہ اسے قبول کرتی ہے کہ وہ ابھی وہاں تک نہیں پہنچی۔ چنانچہ آج تک کوئی سائنس داں ایسا نہیں گزرا جو قرآن پاک میں ذکر کردہ کسی نشانی یا سائنسی حقائق کو جھٹلا سکے۔ پوری دنیا کے سائنس داں یہ کہنے کی جرات نہیں کرپائے کہ وہ قرآن پاک کی کسی بات کو صرف اس بنیاد پر غلط

کہیں کہ وہ عقلی بنیاد پر پوری نہیں اترتی۔

خود قرآن انسان کو یہ چیلنج دے رہا ہے کہ اس دنیا میں جتنے بھی بہترین عقل رکھنے والے لوگ ہیں، وہ سب مل کر اس قرآن کی ایک سورت کی مانند ہی کوئی سورت بنا کر لے آئیں۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

ترجمہ: اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر اتارا ہے، تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنالاؤ۔ اور، اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلالو۔ (سورۃ البقرہ، 23)

قرآن نے یہ چیلنج اپنے مخالفین کو آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے دیا تھا۔ آج بھی یہ چیلنج قرآن میں موجود ہے، لیکن اتنی مادی ترقی کے باوجود بڑے سے بڑا ماہر فن اس چیلنج کو قبول کرنے اور ایک سورت بنانے کے قابل نہیں ہو پایا۔ یورپ میں قرآن اور دیگر مذاہب کے مطالعہ کیلئے تقابل ادیان (Confrontation of religions) کے عنوان سے بڑے بڑے ادارے قائم ہیں جہاں بڑے بڑے مستند اسکالرز اپنی پوری زندگیاں مذاہب کے مطالعہ پر صرف کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ تمام عقل کل مل کر بھی قرآن کی ایک سورت کے مماثل ایک سورت لکھ نہیں پائے۔ قرآن کا یہ چیلنج جو بہ ظاہر سادہ دکھائی دیتا ہے، انسان کیلئے اسے قبول کرنا ناممکن رہا ہے اور ناممکن رہے گا۔

اس کے برخلاف، ایک مصنف بڑی عرق ریزی سے ایک کتاب لکھتا ہے تو اسی کے حلقے سے کوئی نہ کوئی ایک محقق ایسا ضرور ہوگا جو اس کی کتاب میں کوئی سقم یا غلط بات ثابت کردے گا۔

پنجم، قرآن میں آپ کو کہیں کوئی تضاد نہیں ملے گا۔ کتاب کی یہ خوبی بھی اسے مستند

بناتی ہے۔ اور، انسان مجبور ہوتا ہے کہ چونکہ اس میں پیش کی گئی باتیں emparical based ہیں، لہٰذا انھیں قبول کرنا ہوگا۔ یہ خوبی شاید ہی دنیا کی کسی دوسری کتاب (خواہ کسی زبان میں، کسی موضوع پر، کسی زمانے میں لکھی گئی ہو) میں پائی جاتی ہو۔

ششم، قرآن کریم دنیا کی واحد کتاب ہے جو بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو زبانی یاد ہے۔ یہ کتاب ساڑے چھے ہزار سے زائد آیات پر مشتمل ہے، لیکن اس کے باوجود آپ کو لاتعداد بچے اور بڑے مل جائیں گے جنھیں یہ کتاب زبانی یاد ہے۔ پوری دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں، ان مسلمان بچوں کی زبان کوئی بھی ہو، لیکن وہ قرآن ایک انداز سے پڑھتے ہیں اور ان میں رتی برابر فرق نہیں پایا جاتا۔ کیا آپ دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو یاد ہے؟ بچوں کو اپنی پسندیدہ قصے کہانیاں بھی یاد ہوتے ہیں، لیکن ہر بار وہ جب ایک ہی قصہ سناتے ہیں تو اس کے الفاظ اور بیان میں نمایاں تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ قرآن آپ جتنی بار سن لیں، ایک حرف یا حرکت کا فرق نہیں ملے گا۔ ہر بار ایک ہی انداز سے پڑھا جاتا ہے۔

ہفتم، ہمیں یہ معلوم ہے کہ قرآن ایک معجزاتی کتاب ہے اور وہ اللہ رب العزت کا کلام ہے۔ یہ قرآن ہم تک اللہ کے آخری نبی اور رسول آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے پہنچا۔ ہم سب جانتے ہیں اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے اتارا گیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے سامنے قرآنی آیات پڑھتے تھے اور وہ صحابہ یہ آیات یاد کر لیتے تھے یا لکھ لیتے تھے۔ اس طرح، قرآن 23 برس میں جمع ہوتا رہا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپؐ کی زندگی میں لاکھوں لوگوں نے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت ایک تاریخی اور وجودی حقیقت ہے جس سے کوئی انکاری نہیں۔

یہاں نکتہ یہ ہے کہ سب جانتے ہیں اور یہ بات مصدقہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی انسان نے نہیں پڑھایا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ویسے کوئی استاد نہیں تھا جیسے ہمارے

ہاں بچوں کو پڑھانے کیلئے استاد مقرر کیے جاتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسی خوبی کو ''اُمّیؐ'' کہا گیا ہے۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی استاد نہیں سکھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ باتیں کیسے معلوم ہوگئیں جو اس قرآن میں بیان کی گئی ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ قرآن تو سب سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھتے تھے اور پھر صحابہ کرام اسے محفوظ کر لیتے تھے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ غیر معمولی اور non-challenging علم کہاں سے مل گیا؟

یہ سوال ہی اپنے اندر جواب رکھتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی خود ایک بڑا معجزہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے لے کر ارتحال تک ایک ایک لمحہ تاریخ میں محفوظ اور documented ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی ایک عوامی زندگی (Public life) ہے۔ حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نجی زندگی (Private life) بھی اتنی شفاف ہے کہ اسے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواج (اور ہماری امہات) اور قریبی صحابہ کرام نے محفوظ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا قطعاً ناممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی سے کچھ ایسا سیکھ لیا ہوگا جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن میں بیان کر دیا ہو۔ یہ بعید از قیاس اور بعید از دلیل ہے۔

ہم پہلے یہ سائنسی اصول ذکر کر چکے ہیں کہ کسی تحقیق میں اگر خطا کا فرق 5 فیصد سے کم ہو تو اسے human intervention کہہ کر سو فیصدی قبول کر لیتے ہیں۔ بر سبیل تذکرہ یہ بھی بتا تا چلوں کہ آج تک کوئی انسانی دریافت یا تحقیق ایسی نہیں جو سو فیصدی درست مانی گئی ہو۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی درجے میں یہ فرق ضرور پایا جاتا ہے۔

لیکن، قرآن میں جو سائنسی حقائق بیان کیے گئے ہیں، وہ ساڑھے چودہ سو سال سے آج تک نہیں بدلے۔ وہ آج بھی سو فیصد درست تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ سائنسی حقائق جو آج کا انتہائی ایڈوانسڈ انسان آج جاننے کے قابل ہوا ہے، وہ معلومات ساڑھے چودہ سو سال پہلے کیسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہاں سے مل گئیں جنھیں آج کا

سائنس داں درست تسلیم کرنے پر مجبور ہے؟ آں حضرت محمد ﷺ کو کس نے اتنی مستند (authentic) معلومات اور علم فراہم کیا؟ کیا معلوم انسانی تاریخ ہمیں ایسا کوئی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے کسی انسان سے با قاعدہ یا بے قاعدہ اس حوالے سے تعلیم حاصل کی ہو؟ ماہرین اور تاریخ دانوں کے پاس اس کا جواب نفی میں ہے۔

اب ہمارے پاس یہ ثبوت آ گیا ہے کہ چونکہ قرآن میں حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ معلومات (جنھیں جدید ترین سائنسی بنیادوں پر ثابت کیا جا چکا ہے) درست ہیں، اس لیے علمی اور emaparical بنیادوں پر ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ انسان کے دائرۂ اختیار سے جو معلومات باہر ہیں یعنی روح اور روحانی علوم سے متعلق باتیں، وہ بھی اس قرآن میں اتنی ہی درست ہیں جتنی اس میں بیان کی گئی مظاہر فطرت اور انسانی نفسیات سے متعلق مصدقہ اور ثابت شدہ معلومات۔

****

یہاں سے میں واپس اس موضوع پر آتا ہوں جہاں سے میں نے اپنی بات شروع کی تھی کہ مجھے ایک امریکی یونیورسٹی کیلئے عیسائی چرچ کی اسکالرشپ مل گئی۔ یہ بات بتا تا چلوں کہ مجھے یہ اسکالرشپ اس لیے ملی کہ پاکستان میں بی ایس کمپیوٹر سائنس نہیں تھا۔ وہاں جانے کے بعد جب میں نے اس موضوع کو گہرائی میں پڑھنا شروع کیا تو مجھے سسٹم اینالسس اور ڈیزائن پڑھایا گیا۔ اس دوران مجھے، منطق اور سائنس بھی پڑھنے کا موقع ملا۔ اس دوران میرا یہ مزاج بنا کہ اگر منطق (Logic) ہوگی تو بات مانوں گا، منطق نہیں ہوگی تو بات نہیں مانوں گا۔ یوں، ہوا یہ کہ مجھے دین کا جواب منطق سے حاصل بھی کرنا ہے اور دین کا جواب منطق سے بتانا بھی ہے۔ یہ وہ چیلنج تھا جس سے میں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ پس منظر اس کتاب کی ابتدا میں بتانا اس لیے ضروری سمجھا کہ میں نے گزشتہ تیس برس اس موضوع پر تحقیق میں لگائے ہیں اور پھر مذہب کو سمجھا ہے... یہ میرا ماڈل ہے۔ میں

نے اس ماڈل میں اپنے لیے یہ عرض داشت پیش کی ہے کہ ''میں کون ہوں''... اور اس ضمن میں، آپ کو بالکل اس بات کی اجازت ہے کہ آپ اس ماڈل کو کلی یا جزوی طور پر تسلیم یا تردید کریں۔ کیوں کہ میں عقل کل ہونے کا دعوے دار نہیں، قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں نے قرآن اور سنت اور منطق کی روشنی میں خود کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ ہاں، یہ ضرور چاہوں گا کہ کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ اور غور کیا جائے، پھر کوئی رائے قائم کی جائے۔

''میں کون ہوں'' یا خودشناسی کا یہ ماڈل میرے بیش تر سوالات کا جواب ہے... اور مجھے امید ہے کہ جب آپ اس کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اپنے بھی بہت سے سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔ اس ماڈل نے جیسے میری تشفی کی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ایسے ہی آپ کو بھی اس ماڈل سے رہ نمائی مل سکتی ہے۔

اس کتاب کے ذریعے میں نے ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے کہ اپنے خیالات و افکار کو جس انداز سے میں نے جانا اور پرکھا، آپ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ عوامی سے زیادہ ایک علمی کاوش ہے، اور جیسا کہ اصول ہے، علم میں ہمیشہ اختلاف کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ لہٰذا، یہ بالکل ہوسکتا ہے کہ آپ کو میری رائے اور تجزیے سے اختلاف ہو اور کہیں آپ کو میری بات اپنی ہی بات لگے۔

تاہم، اس ضمن میں، صرف یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے پہلے، کرنے کے دوران اور اختتام مطالعہ... خود کو بالکل ایک مبتدی طالب علم کے مقام پر رکھیے اور پھر پڑھیے، سوچیے اور سمجھیے۔ یہ گزارش اس لیے کر رہا ہوں کہ اگر ہم خود کو پہلے سے جو کچھ جان چکے ہیں، اس کی روشنی میں کچھ ایسا جانچنے کی کوشش کرتے ہیں، جو ہماری گزشتہ یا حاصل کردہ اب تک کی معلومات سے مختلف یا متضاد ہوتا ہے... خواہ یہ کتنا ہی درست اور محقق ہو... ہم اسے قبول کرنے میں متذبذب ہوتے ہیں۔

قصے کا آغاز

اس قصے کا آغاز انسان سے ہوتا ہے... یعنی مجھ سے اور آپ سے... ہمارے آبا و اجداد سے... خواہ گزشتہ صدی میں ہو گزرے ہوں یا کئی ہزار سال پہلے اپنی زندگی گزار کر جا چکے ہیں۔

چنانچہ سب سے پہلے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں ایک انسان کی حیثیت سے جو آپ کے سامنے کھڑا ہوں، اس کا مبتدا کیا ہے، منبع کیا ہے۔ میں کون ہوں اور دیگر مخلوقات کے مقابلے میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جو مجھے سب سے ممتاز کرتی ہیں۔

غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان اس پوری کائنات میں موجود تمام مخلوقات میں سب سے افضل اور اشرف ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق، دنیا میں سات ہزار اقسام کی انواع پائی جاتی ہیں۔ پھر ان میں سے ہر نوع کی لاتعداد قسمیں ہیں۔ جیسے سیب ایک نوع ہے تو سیب میں بہت سی قسمیں اور خاندان آجاتے ہیں۔ یہ سب مل کر نہ جانے کتنی مخلوق بنتی ہیں۔ اللہ ہی کو علم ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کل انواع کی تعداد کتنی ہے، یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان تمام مخلوقات اور انواع میں اللہ تعالیٰ نے سب سے برتر اور بہتر ''انسان'' کو بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فضیلت یوں بیان فرمائی:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ

الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ()

ترجمہ: اور، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے، اور انھیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے، اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔ (سورہ بنی اسرائیل، 70)

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دیگر تمام مخلوقات کے مقابلے میں انسان کے سب سے باعزت و بارتبہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ اقبال کا یہ شعر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری تحقیر ہوتی ہے
میں مسجودِ ملائک ہوں، مجھے انسان رہنے دو

قرآن سے ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق ہی انسان کیلئے کی گئی ہے تاکہ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے ان سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ()

ترجمہ: وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے، تمہارے لیے پیدا کیا ہے، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ ان کو سات آسمانوں کی شکل میں ٹھیک ٹھیک بنا دیا۔ اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔ (سورۃ البقرہ، 29)

ایسے ہی تسخیر کائنات کا کام اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے کیا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ()

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات (اللہ تعالیٰ) جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کیا، ورنہ ہم انھیں قابو میں لانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ (سورہ ابراہیم، 33)

اللہ کا علم مادی وغیر مادی اشیاء کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں پر فیصلہ کن برتری کا حامل ہے۔ کسی بھی جائز علم کے معیار کا تعین اس علم کے ذریعے دست یاب ہونے والے قرب الٰی اللہ کے مواقع سے ہے۔ اللہ کی کائنات میں پھیلی اللہ کی تمام مادی نشانیوں میں قربِ الٰہی کے تمام مواقع موجود ہیں یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بہ جا ان مادی نشانیوں پر غور و فکر کی عام دعوت دی ہے۔ علم و عمل کے بعد بھی کام یابی و ناکامی اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ مادی علوم میں سب انسان کائنات کی تسخیر کے لیے اپنی صلاحیتوں کو آزماتے آئے ہیں مگر کام یابی کی ایک نسبتاً واضح اور بہتر عملی صورت آج کے دَور میں ہی کیوں ممکن ہوئی؟

غاروں سے لے کر جدید دنیا تک کے اب تک کے سفر میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ تدریج عمل میں رہا اور آئندہ بھی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تدریج کے ساتھ علم کی دولت سے فیض یاب کیا ہے۔ انسان کو آج تمام تر علمی اور تکنیکی ترقی حاصل کرنے کے بعد بھی آفاقی مظاہر پر مکمل عبور حاصل نہیں ہے۔ اس سے کائنات پر اللہ تعالیٰ زبردست گرفت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بتاتے چلیں کہ عموماً یہ بات کہی جاتی ہے کہ انسان تسخیر کائنات کیلئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کیلئے درج بالا قرآنی آیت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ لیکن قرآنی تعلیمات کی رُو سے یہ بات غلط ہے۔ اس آیت میں واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تسخیر کائنات کیلئے نہیں بھیجا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تسخیر کی ہیں (مسخر) تا کہ ان چیزوں کو اپنے قابو میں لے کر ان سے فوائد حاصل کر سکے۔ اگر اللہ تعالیٰ مسخر نہ فرماتے تو انسان کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کائنات کی تمام چیزوں کو دریافت اور ایجاد کرتا۔ بہ ہر کیف، یہ آیت انسان کی اشرفیت کو بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات انسان کے فائدے کیلئے تخلیق کی ہے۔ اور، اس کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ روئے زمین انسان کے قدموں کے نیچے بچھا دی گئی ہے۔

اگلا مرحلہ: اللہ کی نیابت

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔

اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً ...

ترجمہ: میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں... (سورۃ بقرہ، آیت 30)

آگے چل کر دوبارہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

ترجمہ: اس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا ہے اور بعض کے بعض پر درجے بلند کر دیے ہیں تا کہ تمہیں آزمائے اس میں جو اس نے تمہیں دیا ہے، بے شک البتہ تیرا رب جلدی عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ الانعام، 165)

انسان کے لغوی معنی

انسان عربی زبان کے لفظ اَلۡاِنۡس سے مشتق ہے کسے معنی آدمی اور بشر کے ہیں۔ اَلۡاِنۡس کے ساتھ اِن لگانے سے اس میں مبالغہ آتا ہے اور لفظ اِنۡسَان بنتا ہے۔ (مختار الصاح، مترجم)

القاموس المحیط کے مولف علامہ مجد الدین فیروز آبادی (متوفی 1415ء) لکھتے ہیں:

''بشر انسان کو کہتے ہیں۔ بشر کا معنی انسان کی ظاہری کھال ہے اور کھال کو کھال سے ملانا مباشرت کہلاتا ہے، اور بشارت اور بشریٰ کا معنی خوش خبری دینا ہے۔''

بعض اہل لغت کے نزدیک انسان کا لفظ انیس سے ہے، جس کا مطلب انس کرنے والا یعنی دوست بنتا ہے۔ اس رُو سے انسان کو انسان اس لیے کہا گیا کہ اس کے اندر فطرتاً

محبت اور دوستی کا مادہ رکھا گیا ہے۔ وہ تنہا کچھ نہیں، حتیٰ کہ زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔

یہی بہت اہم گتھی ہے کہ انسان کیا ہے، کون ہے اور کیسے ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہمیشہ سے اور ہر انسان کو گاہے گاہے کچوکے لگاتے ہیں۔ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اس کا مبتدا اور منبع کیا ہے۔ وہ کن چیزوں سے مل کر بنا ہے۔

غور کیجیے تو یہ بات پتا چلتی ہے کہ انسان بنیادی طور پر دو اجزا سے مل کر بنا ہے: اول، جسم (Physical Body) اور دوم، روح (Soul)۔

آغاز ہوا تو انسان روح کی شکل میں تھا۔ قرآن نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے:

اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَہِدۡنَا ۚۛ

ترجمہ: (اور اے رسول، لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب تمہارے رب نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے اُن کی ساری اولاد کو نکالا تھا اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا (اور پوچھا تھا کہ) : ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' سب نے جواب دیا تھا: ''کیوں نہیں، ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ (سورۃ الاعراف، آیت 172)

مفسرین نے لکھا ہے کہ ان آیات میں عالم ارواح کا ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان ''عبد اور معبود'' کا عہد ہوا۔ اس وقت تک انسان کو اس دنیا میں نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ وہ ابھی آسمانوں ہی پر کہیں تھا۔ اس دَور کو ''عہد الست'' اور ''عہد ازل'' بھی کہا گیا ہے۔

یہ عہد کیا تھا؟ اس عہد کے تحت تمام انسانوں نے یہ مانا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام جہانوں کا خالق اور مالک ہے، آسمانوں اور زمین میں جو بھی مخلوق ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہے۔ وہی اللہ تنہا تمام قوانین بنانے والا ہے، کوئی اس کی قانون سازی یا حکم رانی میں مداخلت نہیں کرسکتا۔ کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کا حق حاصل نہیں (کیوں کہ کسی شے پر اعتراض کرنے کیلئے اس معاملے میں گہرائی اور مہارت کا ہونا بھی تو ضروری ہے)۔ اس

قانون کے تحت ہر شے قیامت تک چلتی رہے گی۔ چنانچہ جو لوگ اس قانون کے مطابق اپنی زندگی گزاریں گے، وہ راحت میں رہیں گے اور جو قانون کے خلاف چلیں گے، ایسے خلاف ورزی کرنے والوں کیلئے دنیا میں مشقت و ابتلا اور آخرت میں عذاب ہے۔

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے یہ میثاق عرفات کے میدان میں لیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت مبارک سے ان تمام روحوں کو نکالا گیا جو قیامت تک ان کی نسلوں سے پیدا ہونے والے تھے۔ پھر، انھیں روحوں کی شکل میں متشکل کیا گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں کے سامنے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: الست بربکم کہ جواب دو، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

قَالُوۡا بَلٰی! تمام روحوں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا کہ بے شک، آپ ہی ہمارے رب ہیں۔

اس آیت میں شَہِدۡنَا کا لفظ اس جانب اشارہ ہے کہ اس وقت جو تمام انسان اور فرشتے بلکہ تمام مخلوقات موجود تھے، ان تمام کو گواہ بنایا گیا۔ اول، اللہ تعالیٰ نے توحید کا میثاق لیا کہ اللہ ہی نے انسان کو تخلیق کیا ہے اور پھر اس میثاق پر گواہ بنایا گیا جیسے عام طور پر، اگر کوئی معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی توثیق کیلئے گواہ بھی رکھے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گواہی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں عطا کر رکھی ہے۔ مفسرین نے اس پر بڑی تفصیل سے بات کی ہے۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تفسیر ''معارف القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''(ان سے اس وقت کا واقعہ ذکر کیجیے) جب کہ آپ کے رب نے (عالم ارواح میں آدم (علیہ السلام) کی پشت سے تو خود ان کی اولاد کو اور) اولاد آدم کی

پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور (ان کو سمجھ عطا کر کے) ان سے انھی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے (اس عقل خداداد سے حقیقت امر کو سمجھ کر) جواب دیا کہ کیوں نہیں (واقعی آپ ہمارے رب ہیں، حق تعالیٰ نے وہاں جتنے ملائکہ اور مخلوقات حاضر تھے سب کو گواہ کر کے سب کی طرف سے فرمایا، ہم سب واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں (اور یہ اقرار اور شہادت سب اس لیے ہوا کہ) تا کہ تم لوگ (یعنی جو تم میں ترک توحید اور اختیار شرک پر سزا پائیں)۔ قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بیخبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ (اصل) شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کے نسل میں ہوئے۔۔۔ انسان کے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ شانہ کی عظمت وقدرت کی وہ بے شمار نشانیاں ہیں جن پر ذرا بھی غور کرنے والا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے غافل نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے (آیت) وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ، وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جاننے والوں کیلئے اور خود تمہارے وجود میں بھی۔ کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے۔۔۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: کل مولود یولد علی الفطرۃ، وفی بعض الروایات علی ھذہ الملۃ (اخرجہ البخاری ومسلم) یعنی ہر پیدا ہونے والا دین فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اور، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے۔ پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دور لے گئے۔ اسی طرح بالخاصہ اثر رکھنے والے بہت سے اعمال واقوال ہیں جو

اِس دنیا میں بھی انبیاء (علیہم السلام) کی تعلیم سے جاری ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ان کو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور یاد رکھے یا نہ رکھے، وہ بہر حال اپنا کام کرتے اور اپنا اثر دکھلاتے ہیں۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔اس آیت کی تفسیر میں حضرت اُبَیّ بن کَعب نے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے۔ وہ فرماتے ہیں: 'اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور (ایک ایک قسم یا ایک ایک دور کے) لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کر کے انھیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی۔ پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انھیں آپ اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے عرض کیا، ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین وآسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھیراتا ہوں تا کہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔ میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے، آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔' اس معاملہ کو بعض لوگ محض تمثیلی انداز بیان پر محمول کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل یہاں قرآن مجید صرف یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ اللہ کی ربوبیت کا اقرار انسانی فطرت میں پیوست ہے، اور اس بات کو یہاں ایسے

انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا یہ ایک واقعہ تھا جو عالم خارجی میں پیش آیا۔ لیکن ہم اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔ قرآن اور حدیث دونوں میں اسے بالکل ایک واقعہ کے طور پر بیان گیا گیا ہے اور صرف بیان واقعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے روز بنی آدم پر حجت قائم کرتے ہوئے اس ازلی عہد واقرار کو سند میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے محض ایک تمثیلی بیان قرار دیں۔ ہمارے نزدیک یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع ان تمام انسانوں کو جنھیں وہ قیامت تک پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، بہ یک وقت زندگی اور شعور اور گویائی عطا کر کے اپنے سامنے حاضر کیا تھا، اور فی الواقع انھیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کوئی رب اور کوئی الٰہ اس کی ذاتِ اقدس واعلیٰ کے سوا نہیں ہے، اور ان کیلئے کوئی صحیح طریق زندگی اس کی بندگی وفرماں برداری (اسلام) کے سوا نہیں ہے۔ اس اجتماع کو اگر کوئی شخص بعید از امکان سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرۂ فکر کی تنگی کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت میں تونسلِ انسانی کی موجودہ تدریجی پیدائش جتنی قریب از امکان ہے، اتنا ہی ازل میں ان کا مجموعی ظہور، ابد میں ان کا مجموعی حشر ونشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحب عقل وشعور اور صاحب تصرف واختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیت خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت سے آگاہی بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار لے۔ اس معاملہ کا پیش آنا قابلِ تعجب نہیں، البتہ اگر یہ پیش نہ آتا تو ضرور قابلِ تعجب ہوتا۔''

الغرض، قرآن کریم کی تمام تفاسیر میں یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بینا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں اور بھی کئی مقامات پر اس واقعے کا ذکر کسی نہ کسی انداز سے ملتا ہے جس سے اس واقعے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب ہم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جائیں گے تو اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تمہیں یاد ہے کہ اس سے پہلے بھی تم میرے سامنے اس بات کا اقرار کر چکے ہو کہ میں تمہارا رب ہوں۔

دوسری جگہ جب آں حضرت ﷺ کے پیغام کو کفار نے جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کفار کو جھنجھوڑ کر اس عہد کو یاد دلایا کہ تم اپنے عہد سے روگردانی کیوں کرتے ہو۔ سورۂ نوح میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں:

مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝

ترجمہ: تمہیں کیا ہوگیا کہ تم اللہ کی عظمت سے بالکل نہیں ڈرتے۔ حالانکہ اسی نے تمہیں تخلیق کے مختلف مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا ہے۔ (سورۂ نوح، 13، 14)

ان آیات سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے روحوں کو پیدا کیا اور پھر ان روحوں سے پوچھا کہ بتاؤ، تمہارا رب کون ہے؟ پھر ہم نے وہاں شہادت دی۔ یہ شہادت کیسی تھی؟ یہ بالکل ایسی ہی شہادت تھی جیسے آپ کے ہاتھ میں یہ کتاب موجود ہے اور آپ اس کا مطالعہ کر رہے ہیں تو آپ یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہاں، میرے ہاتھ میں ڈاکٹر محمد عمران کی کتاب ہے اور وہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ بعد میں اگر کوئی آپ سے کہے کہ وہاں ڈاکٹر عمران موجود نہیں تھے تو آپ اسے حیرت سے دیکھیں گے اور کہیں گے کہ بھائی، یاد کرو، ڈاکٹر عمران وہاں تھے؛ تم کیسے اس بات کا انکار کر سکتے ہو۔ اس مثال کا مقصد یہ سمجھانا ہے کہ ہم اپنے رب سے اپنی روح کی سطح پر ملاقات کر چکے ہیں اور اس کی ربوبیت کی شہادت دے چکے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی یہ اعتراض کرتا ہے کہ مجھے تو اللہ سے کیا ہوا یہ

عہد و پیمان یاد نہیں ہے تو اس سوال کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ کیا آپ کو اپنی پیدائش یاد ہے؟ یقیناً، کسی کو بھی اپنی پیدائش کا واقعہ یاد نہیں ہوتا، لیکن ہم سب اس پر ایسا یقین رکھتے ہیں جیسے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ لہٰذا، کسی چیز کا یاد رہ جانا، اس بات کی واحد دلیل نہیں کہ وہ شے وجود رکھتی ہے۔ ایسے ہی جو شے ہمیں معلوم یا یاد نہیں، یہ بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ شے وجود نہیں رکھتی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس روح کو مادی جسم کے اندر منتقل کیا۔ پھر آپ اگر غور کریں تو انسانی روح کو انسانی جسم میں منتقل کرنے کے بہت سے مراحل ہیں جو کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتے۔ آج سائنس اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ وہ ان مراحل کو کھوج رہی ہے اور ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہو رہا ہے کہ کتنے حیرت انگیز اور ناقابل یقین اور مہین مراحل سے گزر کر انسان اس دنیا میں آتا ہے۔

سورہ حج میں اللہ تعالیٰ نے تفصیلاً اس کا تذکرہ کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ
ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ
لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ
لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ
لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا
عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝

ترجمہ: اے لوگو، اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں شک ہے (تو ذرا سوچو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سی پیدا کیا۔ پھر نطفے سے۔ پھر ایک جمے ہوئے خون سے۔ پھر ایک گوشت کے لوتھڑے سے جو (کبھی) پورا بن جاتا ہے اور (کبھی) پورا نہیں بنتا تاکہ ہم تمہارے لیے (تمہاری) حقیقت کھول کر بتا دیں۔ اور ہم (تمہیں) ماؤں کے پیٹ میں

جب تک چاہتے ہیں، ایک متعین مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر ایک بچے کی شکل میں تمہیں باہر لاتے ہیں۔ پھر (تمہیں پالتے ہیں) تاکہ تم بھرپور عمر تک پہنچ جاؤ۔ اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو (پہلے ہی) دنیا سے اٹھا لیے جاتے ہیں، اور تم ہی سے بعض وہ ہیں جنھیں بدترین عمر (یعنی انتہائی بڑھاپے) تک لوٹا دیا جاتا ہے؛ یہاں تک کہ وہ سب کچھ جاننے کے باوجود کچھ نہیں جانتے۔ (سورہ حج، آیت 5)

یہ آیت منکرین قیامت کی دلیل کیلئے اللہ تعالیٰ نے آں حضرت ﷺ پر نازل فرمائی۔ پہلی پیدائش کے پراسیس کو دلیل کے طور پر اختیار کیا گیا اور بتایا گیا کہ پہلی مرتبہ کسی شے کی تخلیق مشکل ہوتی ہے یا دوسری مرتبہ؟ یقیناً، یہ بات کم عقل بھی سمجھ سکتا ہے کہ پہلی مرتبہ کسی شے کی تخلیق مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔

انسان کی موجودہ پیدائش جس کے تحت ہم سب آج اس روئے زمین پر زندگی گزار رہے ہیں یا ہم سے پہلے کھربوں انسان زندگی گزار کر جا چکے ہیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ دوسری زندگی بھی ممکن ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یاد دلا رہے ہیں کہ اگر تمہیں مرنے کے بعد اپنی دوبارہ زندگی پر شک ہے تو اپنی اس دنیا کی پہلی پیدائش پر ہی غور کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پہلے مٹی سے بنایا، پھر آپ کو حقیر پانی کے قطروں سے پیدا کیا جس کے جسم یا کپڑوں پر لگ جانا بھی آپ کو ناگوار ہوتا ہے۔ پھر اس بے قدر قطرے سے جو حمل ٹھہرا، اس نے گوشت کے ایک چھوٹے سے لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ چالیس دن تک یہ نطفہ اپنی شکل میں بڑھتا رہا۔ چالیس دن بعد اس میں خون کی سرخ پھٹکی پڑ جاتی ہے۔ اگلے چالیس دن بعد وہ گوشت کے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی کوئی صورت یا شبیہ نہیں ہوتی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے صورت بھی عنایت کرتے ہیں کہ سر، ہاتھ، سینہ، پیٹ، رانیں، پاؤں اور دیگر اعضا بن کر انسانی دھڑ نمودار ہوتا ہے۔

پھر، چالیس چالیس دن کے تین مراحل (120 دن) مکمل ہونے کے بعد اللہ

تعالیٰ اپنے حکم سے اس میں روح پھونکتے ہیں تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ پھر اگلے پانچ مہینے وہ اپنی ماں کے پیٹ میں مزید پرورش پانے کے بعد ٹھیک ٹھاک ایک حسین مرد یا عورت کی صورت میں اس دنیا میں آتا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنی زندگی کے معینہ ایام پورے کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ بڑھاپے تک پہنچتا ہے۔ یہ وہ دَور ہوتا ہے کہ وہ چاہے کتنا ہی طرم خاں ہو، کتنا ہی ذہین اور ماہر ہو، اس عمر میں اکثر بڑھاپے کی وجہ سے وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے جو وہ ساری زندگی بڑے طمطراق سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ایسے ہی بڑھاپے میں آدمی کی یادداشت بھی ماند پڑنے لگتی ہے اور وہ یاد کیا ہوا بھولنے لگتا ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں اس بارے میں یوں ذکر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا:

حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الرَّبِيعِ ، حَدَّثَنَا أَبُو الْأَحْوَصِ ، عَنْ الْأَعْمَشِ ، عَنْ زَيْدِ بْنِ وَهْبٍ ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ ، حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ ، قَالَ : إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللَّهُ مَلَكًا فَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ ، وَيُقَالُ لَهُ : اكْتُبْ عَمَلَهُ وَرِزْقَهُ وَأَجَلَهُ وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ فَإِنَّ الرَّجُلَ مِنْكُمْ لَيَعْمَلُ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ كِتَابُهُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ ، وَيَعْمَلُ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّارِ إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ .

ترجمہ: ہم سے حسن بن ربیع نے بیان کیا، کہا ہم سے ابوالاحوص نے، ان سے اعمش نے، ان سے زید بن وہب نے اور ان سے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم سے صادق

المصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا اور فرمایا کہ تمہاری پیدائش کی تیاری تمہاری ماں کے پیٹ میں چالیس دنوں تک (نطفہ کی صورت) میں کی جاتی ہے اتنی ہی دنوں تک پھر ایک بستہ خون کے صورت میں اختیار کیے رہتا ہے اور پھر وہ اتنے ہی دنوں تک ایک مضغہ گوشت رہتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اسے چار باتوں (کے لکھنے) کا حکم دیتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اس کے عمل، اس کا رزق، اس کی مدت زندگی اور یہ کہ بد ہے یا نیک، لکھ لے۔ اب اس نطفہ میں روح ڈالی جاتی ہے (یادرکھ) ایک شخص (زندگی بھر نیک) عمل کرتا رہتا ہے اور جب جنت اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کی تقدیر سامنے آجاتی ہے اور دوزخ والوں کے عمل شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص (زندگی بھر برے) کام کرتا رہتا ہے اور جب دوزخ اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کی تقدیر غالب آجاتی ہے اور جنت والوں کے کام شروع کر دیتا ہے۔

ایسے ہی سورہ مومنون میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ () ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ () ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ () ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ()

ترجمہ: پھر ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ٹپکی ہوئی بوند کی شکل میں ایک محفوظ جگہ پر رکھا۔ پھر ہم نے اس بوند کو جمے ہوئے خون کی شکل دے دی۔ پھر جمے ہوئے خون کو ایک لوتھڑا بنا دیا۔ پھر لوتھڑے کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا۔ پھر ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا۔ پھر اسے ایسی اٹھان دی کہ وہ ایک دوسری ہی مخلوق بن کر کھڑا ہو گیا۔ غرض، بڑی شان ہے اللہ کی... جو سارے کاری گروں سے بڑھ کر کاری گر ہے۔ پھر

اس کے بعد یقیناً تمہیں موت آنے والی ہے۔ (سورہ مومنون، آیات 12 تا 15)

سورہ مومنون کی ان چار آیات میں اللہ تعالیٰ انسانی پیدائش کی ابتدا بیان کی ہے کہ اصل آدم مٹی سے ہیں، جو کیچڑ کی اور بجنے والی مٹی کی صورت میں تھی۔ پھر آدم علیہ السلام سے اُن کی اولاد ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کر کے پھر انسان بنا کر زمین پر پھیلا دیا۔ مسند احمد میں رقم ہے کہ میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خاک کی ایک مٹھی سے پیدا کیا، جسے تمام زمین پر سے لیا تھا۔ لہٰذا، اسی اعتبار سے اولادِ آدم کے رنگ روپ مختلف ہوئے۔ کوئی سرخ ہے، کوئی سفید ہے، کوئی سیاہ ہے، کوئی کسی اور رنگ کا ہے۔ پھر ان میں نیک ہیں اور بد بھی ہیں۔

اوپر سورۂ حج اور سورۂ مومنون کے یہ دونوں حوالے اس جانب دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے انسان کو عدم وجود سے وجود بخشا اور ان پورے عمل میں انسان کن کن مراحل سے گزرا۔ یہ تمام مراحل اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اس کے بعد موت کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ اس دنیا کی زندگی میں آمد پر غور کر کے (جو ہمیں آج انتہائی تفصیل کے ساتھ سائنس بھی بتا رہی ہے اور انسان محیرالعقل ہے) یہ تسلیم کرو کہ ایسے ہی تم دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ()

ترجمہ: اُس (اللہ) کی تو یہ شان ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اتنا ہی فرما دیتا ہے کہ ہو جا، سو وہ ہو جاتی ہے۔ (سورۂ یٰسین، 82)

انسان کی تخلیق سے پہلے

قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات تخلیق کی۔ کونیات (Cosmology) یعنی کائنات کے مطالعے کا سائنسی علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ

بگ بینگ سے پہلے زمین اور آسمان ملے ہوئے تھے، پھر انھیں اللہ تعالیٰ نے الگ کیا، انسانی ضروریات کی تمام چیزیں پیدا کی گئیں۔ نظام ہائے شمسی پیدا کیے گئے۔ سات آسمان بنائے، ایک زمین بنائی۔ دیگر بہت سی مخلوقات پیدا کی گئیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَهُمَا فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیۡعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوۡنَ ()

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے چھ روز میں بنایا پھر عرش پر قائم ہوا، تمہارے لیے اس کے سوا نہ کوئی کارساز ہے نہ سفارشی، پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔ (سورۂ سجدہ، 4)

تمام چیزوں کا خالق اللہ ہے۔ اس نے چھ دن میں زمین و آسمان بنائے۔ پھر عرش پر قیام کیا۔ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی شے کا خالق و مالک وہی ہے۔ ہر چیز کی تکمیل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی سب کاموں کی تدبیریں کرتا ہے۔ ہر چیز پر اسی کا غلبہ ہے۔ اس کے سوا مخلوق کا نہ کوئی والی نہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش کر سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں نہ اس کے سوا کوئی پالنہار ہے۔

آدم بننے سے پہلے انسان کے ساتھ کیا ہوا

یہ بہت اہم سوال ہے جس کی تشفی انسانی ذہنی چاہتا ہے۔ زمین کی عمر ایک سائنسی اندازے کے مطابق، 13.7 ارب سال ہے۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں جس کے اندر ہمارا نظام شمسی ہے، اس کی عمر لگ بھگ ساڑھے چار ارب سال ہے۔ لیکن، ہم جس انسان کے رکازات (فوسلز) اب تک اس کرۂ ارض پر تلاش کر پائے ہیں، اس کی عمر دو لاکھ سال ہے۔ البتہ جس آدم کو ہم دیکھتے ہیں یعنی جسے ہم آدم کی شکل میں انسان سمجھتے ہیں، اس کی عمر سائنسی

تخمینوں کے مطابق، صرف 7 سے 9 ہزار سال کے درمیان ہے۔ آدم کو نبوت کے منصب پر تقریباً چھے سے سات ہزار سال پہلے فائز کیا گیا۔ ایسے ہی آسمانی صحائف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو تاریخ پتا چلتی ہے، وہ لگ بھگ پانچ ہزار سال پہلے کی تاریخ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تاریخ تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال پہلے کی ہے۔ خاتم الانبیا آں حضرت محمد ﷺ کی تاریخ تقریباً ساڑھے چودہ سو سال ہے۔

دو لاکھ سال اور سات ہزار سال کے درمیانی وقت میں کیا ہوا؟ جب تک انسان کو آدمیت یا نبوت عطا نہیں ہوئی تھی، وہ اُس وقت تک کس شکل میں تھا؟ اس سلسلے میں، قرآن نے بھی کچھ رہ نمائی کی ہے اور سائنس دانوں نے اپنا سر کھپایا ہے تو ہمیں پتا چلا ہے کہ اس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے پیٹ سے پیدا کیا۔ گارا، چکنی مٹی، کھنکھاتی ہوئی مٹی سے وہ وجود میں آیا۔ یہ انسان کا بالکل ابتدائی مرحلہ ہے جس میں اسے کوئی مقام حاصل نہیں تھا۔ چونکہ اسے کوئی مقام حاصل نہیں تھا، لہٰذا وہ بغیر شعور کی زندگی گزارتا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی مخلوق سے بڑا کام لے گا۔ یہ اللہ کا معاملہ ہے کہ وہ جب کسی کام کیلئے کسی مخلوق کا انتخاب کرنا چاہتا ہے تو اس کا انتخاب خود کرتا اور اس کیلئے اسے تیار کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام چلانے کیلئے جنات کا انتخاب کیا۔ جنات نے اس منصب پر آنے کے بعد اتنی ریاضت اور مشقت کی کہ وہ فرشتوں کی صف میں شامل ہوگئے۔ لیکن، جب یہاں فساد شروع ہوا تو فرشتوں نے اس کائنات کا نظام سنبھالا۔ تب، جنوں کی جگہ فرشتوں کو بہت سے کام تفویض کر دیے گئے۔

ایسے میں اللہ تعالیٰ ایک بہتر خلق کی تخلیق کرنے کا ارادہ فرمایا۔ وہ اتنی بہترین مخلوق ہو کہ اللہ تعالیٰ زمین پر اسے اپنا نائب بنا سکیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے اپنے اس ارادے کا اظہار فرمایا کہ میں اس مخلوق میں سے چننے والا ہوں جو گارے اور مٹی سے بنائی

گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے بعض ایسی ہیں جو نہ شعور رکھتی ہیں اور نہ اختیار۔ بعض شعور رکھتی ہیں، لیکن اختیار نہیں رکھتیں۔ بعض مخلوق شعور بھی رکھتی ہیں اور اختیار بھی رکھتی ہیں۔ جانور نہ شعور رکھتے ہیں اور نہ اختیار رکھتے ہیں۔ انھیں جس جبلت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، وہ اسی کے تحت کھاتے پیتے، اپنی ضروریات پوری کرتے ہوئے اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ فرشتوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شعور رکھتی ہے، مگر اختیار نہیں رکھتی۔ فرشتے سوال پوچھ سکتے ہیں، لیکن ان کے پاس اس سے روگردانی کا اختیار نہیں ہے۔ جن وہ مخلوق ہے جو شعور اور اختیار رکھتی ہے۔ جن شعور رکھتے ہیں، اس لیے سوچتے اور سوال کرتے ہیں، لیکن چاہیں تو اس پر عمل کریں یا نہ چاہیں تو عمل نہ کریں۔ جنوں کے پاس یہ عمل کرنے یا نہ کرنے کا مکمل اختیار ہے۔ اسی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ ارادہ ظاہر فرمایا کہ میں اس مٹی سے خلیفۃ الارض بنانے والا ہوں تو فرشتوں اور جنوں، دونوں نے سوال کیا کہ آپ ایسی مخلوق کو سرداری دینا چاہتے ہیں جو فساد کرے گا؟ جب کہ جن کا اعتراض یہ تھا کہ میرے پاس شعور ہے اور میرا تخلیقی مادہ یعنی آگ اس نئی مخلوق (انسان) کے تخلیقی مادے یعنی مٹی سے بہتر ہے تو آپ کیوں اسے فوقیت دے رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا جواب فرشتوں اور جنوں، دونوں کے سوال پر یہ تھا کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ

ترجمہ: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں، فرشتوں نے کہا کیا تو زمین میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو فساد پھیلائے اور خون بہائے حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں،

فرمایا میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ (سورۃ البقرہ، آیت 30)

اس سوال کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ابھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو آدمیت کے مرتبے پر فائز نہیں کیا تھا۔ ابھی انسان کو نبوت نہیں دی گئی تھی۔ ابھی وہ عام مخلوق تھا... مٹی اور گارے سے بنی ہوئی ادنیٰ مخلوق۔ تاہم، وہ ایک حیثیت اور وجود رکھتا تھا، اگرچہ یہ وجود موجودہ انسانی وجود کی طرح مادی یا ظاہری نہیں تھا کہ جو حواسِ خمسہ سے تجربہ کیا جاسکتے۔ یہ صرف روحانی وجود تھا۔ (واللہ اعلم)

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (1) اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (2) اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (3)

ترجمہ: انسان پر کبھی ایسا وقت آیا ہے کہ نہیں جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا؟ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے اس طرح پیدا کیا کہ اسے آزمائیں۔ پھر اسے ایسا بنایا کہ وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔ ہم نے اسے راستہ دکھایا کہ وہ یا تو شکر گذار ہو، یا ناشکرا بن جائے۔ (سورۃ الدھر، 1 تا 3)

روح کیا ہے؟

روح کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو ہمیشہ سے انسان کیلئے تجسس کا ذریعہ رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان ظاہری طور پر اپنے حواسِ خمسہ کا تجربہ تو بہ آسانی کر لیتا ہے، مگر اس کے باوجود اس کے اندر یہ بازگشت ضرور رہتی ہے کہ کچھ نہ کچھ ان حواسِ خمسہ سے ورا بھی ہے جو اُس کے ادراک سے باہر ہے۔ چونکہ انسان فطرتاً متجسس واقع ہوا ہے، اس لیے وہ جہاں بہت کچھ جانتا ہے، جاننے کی کھوج میں رہتا ہے، وہاں یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ حواسِ خمسہ سے ورا وہ کون سی شے ہے جو اسے چلاتی ہے۔ ایسے بہت سے سوالات اپنی ذات کے بارے میں وہ کرتا ہے جو اسے اپنی کھوج اور اپنی تلاش کے دوران ہوتے ہیں کہ جن کا تعلق اس کے حواس اور ظاہری اور مادی چیزوں سے نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، ایسا کیوں ہے کہ ایک انسان کے اندر ظاہری طور پر سب کچھ ہونے کے باوجود وہ بے حس و حرکت ہوجاتا ہے۔ یہ سوال بہت ہی عام ہے اور جب سے انسان اس دنیا میں بھیجا گیا ہے، تب ہی سے انسان کو کچوکے لگا رہا ہے۔

حواسِ خمسہ کا علم ہمیں بتاتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کیلئے پیروں سے کام لینا پڑتا ہے، بات کرنے کیلئے زبان اور منھ ہلانے پڑتے ہیں، کچھ دیکھنے کیلئے آنکھیں دیکھتی ہیں اور سننے کیلئے کانوں میں آواز کا آنا ضروری ہے۔ ایسے ہی ہم کسی شے کو

چھوکر اسے محسوس کرتے ہیں۔لیکن، یہ سب کچھ محدود ہے، بلکہ بہت محدود ہے۔اگر یہ سب ہوں، مگر روح نہ ہو تو یہ سب اعضا کچھ کام کے نہیں۔ان سب کو کام کے قابل کرنے میں جو قوت کارفرما ہے، وہ ''روح'' کہلاتی ہے۔چنانچہ انسانی جسم سے روح نکلنے کے بعد آدمی مرجاتا ہے، لیکن چند اعضا کچھ وقت کیلئے زندہ رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ''عطیہ اعضا'' () کا تصور وجود میں آیا اور اب پوری دنیا میں اسی بنا پر انسان کی طبعی موت کے بعد اس کے عطیہ کردہ اعضا کو ''منتقلی اعضا'' (Organ Transplant) کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔یہاں آپ کی معلومات اور دلچسپی کیلئے ہم چند انسانی اعضا کی حیات بعد موت کی مدت درج کررہے ہیں:

انسانی دماغ	4 سے 6 گھنٹے
پھیپڑے	4 سے 6 گھنٹے
جگر	8 سے 12 گھنٹے
لبلبہ	12 سے 18 گھنٹے
گردے	24 سے 36 گھنٹے

اس کے علاوہ بعض ٹشوز (اگر اہتمام سے محفوظ کرلیے جائیں تو) پانچ سال تک قابل استعمال رہتے ہیں۔

(بہ حوالہ www.donoralliance.org)

انسان کی طبعی موت کے بعد ایک عضو کتنی دیر قابل عمل (زندہ) رہ سکتا ہے، اس کا انحصار ہر عضو کی انفرادی حالت پر ہوتا ہے۔اور اس کے حالات پر ہوتا ہے۔

لہٰذا، انسانی جسم سے روح خارج ہونے کے بعد وہی ہاتھ پیر ہوتے ہیں، مگر وہ جسم حرکت نہیں کرسکتا۔آنکھیں بالکل درست ہوں گی، مگر ہم دیکھ نہیں سکیں گے۔کان ہوں

گے، مگر ہمارے کانوں میں پڑنے والی آواز ہم سن تو نہیں پائیں گے۔کسی شے کو چکھ یا چھوکر ہم اس کا ذائقہ یا احساس نہیں کرپائیں گے۔کیوں کہ ان سب کے پیچھے جو اصل قوت کام کررہی ہے، وہ ہے روح!

روح... جو کسی انسان کو نظر نہیں آتی... مگر ہر انسان کو ہر وقت اس سے واسطہ پڑتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔چونکہ یہ انسان کی ذات کا اہم عامل ہے، اس لیے انسان ہمیشہ اس کیلئے سرگرداں اور متجسس رہا ہے۔آں حضرت ﷺ کی آمد اور بعثت سے پہلے کے ادوار میں بھی لوگ یہ جستجو رکھا کرتے تھے۔روح کے بارے میں تجسس اور اس بارے میں سوال ہر زمانے میں انسان کو بے چین کرتا رہا ہے۔حتیٰ کہ آں حضرت ﷺ سے بھی اس کے بارے میں سوال کرکے کفار نے آں حضرت ﷺ کی آزمائش کرنے کی کوشش کی۔

قرآن پاک میں سورہ اسرا کی آیت 85 میں اس واقعے کے نتیجے میں جو آیت نازل ہوئی، وہ یہ ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي
وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

ترجمہ: اور یہ لوگ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ (سورہ اسراء، آیت 85)

اس آیت کے تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں آں حضرت ﷺ کے ہم راہ مدینہ کے کھنڈروں میں چل رہا تھا اور آپؐ کھجور کی ایک چھڑی کو زمین پر ٹکا کر چلتے تھے کہ چند یہودی آپ ﷺ کے پاس آئے اور اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ محمد (ﷺ) سے روح کے بارے میں سوال کرو۔اس پر بعض نے کہا کہ نہ پوچھو، مبادا اس میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں جو تم کو بری معلوم ہو۔پھر ان میں سے

ایک شخص نے کہا کہ ہم ضرور آپؐ سے پوچھیں گے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے ابوالقاسم! روح کیا چیز ہے؟ آں حضرت ﷺ خاموش رہے۔ (ابن مسعود کہتے ہیں) میں نے اپنے دل میں کہا کہ آپؐ پر وحی آ رہی ہے، لہٰذا میں کھڑا ہو گیا۔ پھر جب وہ حالت آپؐ سے دور ہوئی، تو آں حضرت ﷺ نے سورہ اسرا کی درج بالا آیت تلاوت فرمائی۔

پوری حدیث مبارکہ صحیح بخاری میں یوں موجود ہے:

'عن عبد اللّٰه ، قال : بینا أنا أمشي مع النبي صلى اللّٰه علیه وسلم في خرب المدینة وهو یتوکأ علی عسیب معه، فمر بنفر من الیهود فقال بعضهم لبعض: سلوه عن الروح، وقال بعضهم: لا تسألوه لا یجيء فیه بشيء تکرهونه، فقال بعضهم: لنسألنه، فقام رجل منهم، فقال: یا أبا القاسم! ما الروح؟ فسکت فقلت: إنه یوحی إلیه، فقمت فلما انجلی عنه قال: ﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾'۔(الاسراء:85)

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ روح دراصل اللہ تعالیٰ کے ایک فیصلے کا نام ہے یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک فیصلے کی شکل ہے۔ یہ فیصلہ کیا ہے، شاید اس کا علم انسان کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت ﷺ سے بھی یہی فرمایا کہ تمہیں کم علم دیا گیا ہے۔ اس بات سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ روح کے معاملات کو سمجھنے کیلئے جو علم اور فہم درکار ہے، وہ انسان کے پاس نہیں ہے۔

روح وہ امرِ ربی ہے جس کے حکم اور پروگرام کے تحت ہمارے وجود کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ انسان کے پاس روح کو مکمل طور پر سمجھنے کا علم نہیں، البتہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو

فراست عطا فرمائی ہے، خاص کر علوم قرآنی اور نبوی کو جاننے والے علمائے ربانی کو دین کی جو بصیرت دی جاتی ہے، اس بنا پر یہ حضرات روح کے بارے میں اتنا ضرور کہتے ہیں کہ روح کا مادہ نور ہے اور یہ توانائی کی ایک قسم ہے۔ ان حضرات میں بھی دو مکاتب فکر ہیں جن میں سے ایک مکتب نے اس معاملے میں کسی تفصیل اور گہرائی میں جانے سے گریز کیا ہے تو دوسرے مکتب نے احتیاط کا دامن تھامتے ہوئے اپنی علمی بساط کے مطابق روح کے بارے میں اظہارِ خیال کیا اور مسئلۂ روح پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے یہ جواب دیا ہے، قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ، اس جواب کی تشریح میں حضراتِ مفسرین کے کلمات اور تعبیرات مختلف ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اقرب اور واضح وہ ہے جو تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اختیار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس جواب میں جتنی بات کا بتلانا ضروری تھا اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آنے کے قابل ہے، صرف وہ بتلا دی گئی۔ اور، روح کی مکمل حقیقت جس کا سوال تھا اس کو اس لیے نہیں بتلایا کہ وہ عوام کی سمجھ سے باہر بھی تھی اور ان کی کوئی ضرورت اس کے سمجھنے پر موقوف بھی نہ تھی۔ یہاں رسولِ کریم ﷺ کو یہ حکم ہوا کہ آپؐ ان کے جواب میں یہ فرما دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے، یعنی وہ عام مخلوقات کی طرح نہیں جو مادہ کے تطورات اور توالد و تناسل کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں، بلکہ وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کے حکم کن سے پیدا ہونے والی چیز ہے... اور انسان کیلئے اتنا ہی علم روح کے متعلق کافی ہے، اس سے زائد علم کے ساتھ اس کا کوئی دینی یا دینوی کام اٹکا ہوا نہیں، اس لیے وہ حصہ سوال فضول اور لایعنی قرار دے کر اس کا جواب نہیں دیا گیا، خصوصاً جب کہ اس کی حقیقت کا سمجھنا عوام کیلئے تو کیا

بڑے بڑے حکما وعقلا کیلئے بھی آسان نہیں ...قرآن کریم نے اس سوال کا جواب مخاطب کی ضرورت اورفہم کے مطابق دے دیا۔حقیقتِ روح کو بیان نہیں فرمایا۔مگراس سے یہ لازم نہیں آتا کہ روح کی حقیقت کوکوئی انسان سمجھ ہی نہیں سکتا اور یہ کہ خود رسولِ کریم ﷺ کوبھی اس کی حقیقت معلوم نہیں تھی۔صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت نہ اس کی نفی کرتی ہے نہ اثبات۔اگرکسی نبی ورسول کووحی کے ذریعہ یاکسی ولی کوکشف والہام کے ذریعے اس کی حقیقت معلوم ہوجائے تو اس آیت کے خلاف نہیں، بلکہ عقل وفلسفہ کی رُو سے بھی اس پر کوئی بحث وتحقیق کی جائے تو اس کوفضول اور لایعنی تو کہا جائے گا،مگر ناجائز نہیں کہا جا سکتا؛اسی لیے بہت سے علماءِ متقدمین ومتاخرین نے روح کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں۔آخری دَور میں ہمارے استاذِ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک مختصر سے رسالے میں اس مسئلے کو بہترین انداز سے لکھا ہے،اوراس میں جس قدر حقیقت سمجھنا عام انسان کیلئے ممکن ہے وہ سمجھادی ہے،جس پر ایک تعلیم یافتہ انسان قناعت کرسکتا ہے، اور شبہات و اِشکالات سے بچ سکتا ہے۔''

(معارف القرآن)

روحِ انسانی کی بحث کومحتاط پیرائے میں اگرآگے بڑھایا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو وجود بنیادی طور پر دوحصوں پر مشتمل ہے: ایک وجودِ حیوانی اور دوسرا وجود روحانی ہے۔وجودِ حیوانی جسم اور جان پر مشتمل ہے جبکہ وجودِ روحانی ایک مستقل شخصیت ہے اور وہ روح ہے۔جسم میں جان ایک کیفیت کا نام ہے،اوراس کا جسم سے علیحدہ کوئی تصور نہیں ہے۔جبکہ روح کا ایک اپنا مستقل وجود ہے۔جسم زمین سے ہے جبکہ روح آسمان سے ہے۔

ارشاد المفتین 1/79 میں ہے:

''ایک لطیف ذات ہے جوہوا کی طرح بدن میں ایسے سرایت کرتی ہے، جیسے پانی درخت کی ٹہنیوں میں سرایت کرتا ہے، روح نفس کی اصل اور اس کا مادہ ہے، اور نفس مرکب ہے دو چیزوں سے روح اور روح کا بدن کے ساتھ اتصال سے۔''

امام غزالیؒ کے بہ قول، روح کے بارے میں ایک ہزار تک اقوال ملتے ہیں۔علامہ ابن قیمؒ نے مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہی ''کتاب الروح'' ہے۔

فلسفیوں کے نزدیک روح جو ہر مجرد ہے غیر مادی شئی ہے۔شاہ ولی اللہؒ نے الطاف القدس اور حجۃ اللہ البالغہ اورتفہیمات میں روح کی حقیقت پر کلام فرمایا ہے۔یونانی فلسفی ارسطو نے مستقلاً ایک رسالہ لکھا ہے۔شیخ ابو العباس احمد سرخسی نے کتاب النفس والروح رسالہ لکھا ہے۔امام غزالیؒ نے معارج القدس میں روح پر کلام کیا ہے۔شیخ محی الدین ابن العربی نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا کہنا ہے کہ روح کی مثال ایسی ہے جیسی پھول میں خوشبو ہوتی ہے۔اللہ پاک کے ارشاد (وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلاً) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روح کی حقیقت کوئی نہیں جانتا، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے روح کا علم ہر کس و ناکس کو نہیں دیا، خاص متعلقین ہی روح کی حقیقت سے واقف ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان پر اس کی حقیقت کو منکشف کیا ہے اور یہ اللہ پاک کا ان پر خصوصی فضل وکرم ہے۔واللہ اعلم (حجۃ اللہ البالغہ)

قرآنی تعلیمات کے مطابق، انسانی روح کا وجود تب سے ہے کہ جب انسانی جسم (خاکی جسم) تخلیق بھی نہیں کیا گیا تھا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو تمام انسانوں کی روحیں حضرت آدم علیہ السلام کے جسم میں داخل کردی گئیں۔(واللہ اعلم) اس کے بعد پلان کے مطابق جب انسان کو زمین پر بھیجے جانے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے

حضرت آدم اور حضرت حوا کو زمین پر ایک متعین وقت کیلئے بھیج دیا۔ قرآن کریم میں اس جانب اشارہ ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

ترجمہ: ہم نے فرمایا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔ (سورہ بقرہ،38)

روح اور جسم دو مختلف چیزیں ہیں

یہاں بہت اہم نکتہ گوش گزار کرنا ضروری ہے کہ انسانی روح اور انسانی جسم دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان دونوں کا domain الگ الگ ہے۔ جب استقرارِ حمل (Contraception) ہوتا ہے تو جسمانی حیات جنین (Embryo) میں پہلے ہی آجاتی ہے، جبکہ اس میں روح ایک سو بیس دن (حمل کا پانچواں مہینہ) بعد ڈالی جاتی ہے۔

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللّٰهِ إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ ...... يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ'۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان کیا کہ تم میں سے ہر ایک کی ابتدائی تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں کی جاتی ہے (چالیس چالیس دن کے تین مراحل میں)... چالیس دن مرحلہ نطفہ میں، پھر اتنی مدت مرحلہ علقہ میں اور پھر اتنی ہی مدت مرحلہ مضغہ میں، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

اس دنیا میں انسان کو جب اس کی روح کے ساتھ بھیجا گیا تو یہ بھی وعدہ لیا گیا کہ وہ اس

دنیاوی یعنی خاکی وجود کے اندر رہتے ہوئے روحانی تقاضوں کو بھی پورا کرے گا۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ

ترجمہ: اور اللہ کا انعام جو تم پر ہوا ہے اسے یاد کرو اور اس کا عہد جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے، جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مان لیا، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ دلوں کی بات خوب جانتا ہے۔ (سورۃ الانعام،7)

چونکہ انسان کے مادی وجود کے ساتھ روحانی وجود منسلک ہے، اس لیے دنیا کی ہر مادی شے کے ساتھ ایک غیر مادی شے بھی نتھی ہوتی ہے۔ اس غیر مادی شے کو ''جوہر'' کہتے ہیں۔ روح انسان کے مادی جسم کا ''جوہر'' ہے۔ یہ غیر مادی جوہر مادی جسم سے الگ ہوجائے تو جسم ختم ہوجاتا ہے، یعنی مرجاتا ہے۔ گویا، ہمارا مادی جسم غیر مادی جوہر پر قائم ہے۔ یہ جوہر جب جسم سے نکل جائے گا تو جسم کا وجود اور اہمیت بھی ختم ہوجائے گی۔ پھر یہ بے کار ہے۔

بعض ماہرین طبیعیات (Physicist) کے بقول، انسان جس دنیا میں رہتا ہے، وہ حواسِ خمسہ کی دنیا ہے اور اسے ہم سہ ابعادی دنیا (3-Dimensional world) کہتے ہیں۔ جبکہ سائنسی مطالعات وتحقیقات کے مطابق، دیگر ابعاد (Dimensions) میں بھی بہت کچھ موجود ہے، لیکن یہ سہ ابعادی دنیا میں رہنے والا انسان سہ ابعادی حواس کے ساتھ دیگر ابعاد کی دنیا کا ادراک کرسکتا ہے نہ تجربہ۔ یہ کوانٹم فزکس کا بہت بڑا موضوع ہے اور آپ چاہیں تو Multivers اور Parallel Universes کے عنوانات سے اس موضوع کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

روح کا اشرف درجہ

اگلا مرحلہ ایک ادنیٰ مخلوق سے اشرف مخلوق کے درجے پر فائز کرنا تھا۔ آپ اس بات

سے اتفاق کریں گے کہ جب کسی کو کوئی بڑا عہدہ دیا جاتا ہے تو اس کا کچھ معیار ہوتا ہے۔ ہر ایک ہر عہدہ اٹھا کر تفویض نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ اہلیت اور قابلیت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب ادنیٰ سے اشرف کے عہدے پر فائزہ کرنے کا سوچا تو ضروری تھا کہ اس میں کچھ مزید خوبیاں اور صلاحیتیں موجود ہوں تا کہ وہ اس عہدے کے تقاضوں اور ذمے داریوں کو بہ حسن وخوبی پورا کر سکے۔ چنانچہ اس غرض سے اللہ تعالیٰ نے تین اقدامات کیے:

لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ

... جسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔

(سورص، آیت 75)

پھر اس کے بعد

دوم

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

ترجمہ: اور آدم کو ہر شے کے اسما سکھائے۔ (سورۃ البقرہ، 31)

تیسرے، اس میں روح پھونکی گئی۔

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي

ترجمہ: اور جب اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ (سورہ ص، 29)

یہ درج بالا تینوں خوبیاں اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق میں نہیں پائی گئیں، سوائے انسان کے۔ چنانچہ جب یہ تینوں چیزیں انسان کو ملیں تو آدم کو نبوت کے مرتبے پر فائز کیا گیا۔

سورہ ص میں زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بیان موجود ہے:

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ () فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ () فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ () إِلَّا إِبْلِيسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ()

ترجمہ: جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک انسان مٹی سے بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے پورے اطمینان سے بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کیلئے سجدہ میں گر پڑنا۔ پھر تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس کے سوا۔ اس نے تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ (سورہ ص، آیات 71 تا 74)

حضرت آدم کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنا ارادہ بتایا کہ میں مٹی سے آدم کو پیدا کرنے والا ہوں۔ جب میں اسے پیدا کر چکوں تو تم سب اسے سجدہ کرنا تا کہ میری فرماں برداری کے ساتھ ہی حضرت آدم کی شرافت و بزرگی کا بھی اظہار ہو جائے۔ پس کل کے کل فرشتوں نے تعمیل ارشاد کی۔ ہاں ابلیس اس سے رکا، یہ فرشتوں کی جنس میں سے تھا بھی نہیں بلکہ جنات میں سے تھا۔ طبیعی خباثت اور جبلی سرکشی ظاہر ہو گئی۔ سوال ہوا کہ اتنی معزز مخلوق کو جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تو نے میرے کہنے کے باوجود سجدہ کیوں نہ کیا؟ یہ تکبر! اور یہ سرکشی؟ تو کہنے لگا کہ میں اس سے افضل و اعلیٰ ہوں کہاں آگ اور کہاں مٹی؟ اس خطا کار نے اس کے سمجھنے میں بھی غلطی کی اور اللہ کے حکم کی مخالفت کی وجہ سے غارت ہو گیا حکم ہوا کہ میرے سامنے سے منہ ہٹا میرے دربار میں تجھ جیسے نافرمانوں کی رسائی نہیں تو میری رحمت سے دور ہو گیا اور تجھ پر ابدی لعنت نازل ہوئی اور اب تو خیر وخوبی سے مایوس ہو جا۔ اس نے اللہ سے دعا کی کہ قیامت تک مجھے مہلت دی جائے۔ اس حلیم اللہ نے جو اپنی مخلوق کو ان کے گناہوں پر فوراً نہیں پکڑتا اس کی یہ التجا پوری کر دی اور قیامت تک کی اسے مہلت دے دی۔ اب کہنے لگا میں تو اس کی تمام اولاد کو بہکا دوں گا صرف مخلص لوگ تو بچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے منصوبے کے تحت یہی منظور تھا۔ اس کا ذکر دیگر قرآنی آیات میں ہے۔ جیسے،

قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ

اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَاَحۡتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ()

ترجمہ: کہا بھلا دیکھ تو یہ شخص جسے تو نے مجھ سے بڑھایا، اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں بھی سوائے چند لوگوں کے اس کی نسل کو قابو میں کر کے رہوں گا۔

(سورہ الاسراء، 62)

اور

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ

ترجمہ: بے شک میرے بندوں پر تیرا کچھ بھی بس نہیں چلے گا مگر جو گمراہوں میں سے تیرا تابعدار ہوا۔ (سورۃ الحجر، 42)

قرآن کی رُو سے زمین پر انسان کے ارتقائی مراحل

اللہ تعالیٰ نے اُس دن یہ کہہ دیا کہ آج کے بعد انسان آدم اور حوا کے ملاپ سے بنے گا۔ پہلے زمین کے پیٹ سے انسان کے قلب کو وجود میں لایا گیا اور اس کے بعد اسی زمین کی خوراک سے جو خون پیدا ہوا، اس سے اللہ تعالیٰ نے نطفہ بنایا اور پھر اس سے اولاد پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سورۃ القیامہ میں اس ضمن میں پورے جاہ وجلال سے فرماتے ہیں:

نَحۡنُ خَلَقۡنٰکُمۡ فَلَوۡلَا تُصَدِّقُوۡنَ () اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ()
ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ()

ترجمہ: ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ ذرا یہ بتلاؤ کہ جو نطفہ تم ٹپکاتے ہو، کیا تم اسے پیدا کرتے ہو، یا پیدا کرنے والے ہم ہیں؟

(سورۃ الواقعہ، 58، 59)

گویا، اللہ تعالیٰ منکر انسان کو یہ جتلا رہے ہیں کہ یہ جو بوند (مادۂ منویہ) ٹپکاتے ہو، یہ تم ٹپکاتے ہو یا ہم ٹپکاتے ہیں۔ بھلا، تم اس قابل کہاں کہ اولاد پیدا کر سکو۔ یہ تو اللہ کی قدرت ہے کہ وہ تمہارے بے قدر پانی سے اتنی حسین اور پیاری اولاد سے تمہیں نوازتا ہے۔ پھر، تم

اکڑے پھرتے ہو کہ میں اولاد والا ہوں۔ ایسے ہی سورہ مومنون کی آیات 12 تا 15 کا تفصیلی ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

آج سائنس اس بات کو ثابت کر چکی ہے کہ ہر جرثومہ (نطفہ) اور ہر انڈا (بیضہ) جان رکھتا ہے۔ سائنس کی ایک شاخ جینیات ہے۔ جینیات بتاتی ہے کہ جب انسانی خون کے ایک لوتھڑے میں لاتعداد خلیے (سیلز) ہوتے ہیں اور ہر سیل میں ڈی این اے ہوتا ہے اور ہر ڈی این اے کے اندر دو ہزار سال سے زیادہ عرصے کی معلومات محفوظ ہوتی ہے۔

آج ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان کے اندر کیا کیا اجزا پائے جاتے ہیں، نظام ہائے جسمانی کیسے کام کرتے ہیں وغیرہ۔ انسان کی سو فیصدی کیمیائی ترکیب سائنس دانوں کے علم میں ہے۔لیکن، اس کے باوجود کسی لیبارٹری میں زندہ انسان نہیں بنایا جاسکتا۔ اگرچہ جسم کی شکل ہر وقت بنائی جاسکتی ہے کیوں کہ زندہ جسم کے اجزا بالکل معمولی کیمیائی ایٹم ہوتے ہیں۔لیکن کیا انسان محض معمولی ایٹموں کا ایک خاص مجموعہ ہے؟

سائنس داں تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی بناوٹ کے تمام اجزا کو جمع کر کے ہم انسان تخلیق نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ایک زندہ انسان کا جسم محض بے جان ایٹموں کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ ایٹم اور زندگی دونوں سے عبارت ہے۔ مرنے کے بعد ایٹموں کا مجموعی تو ہمارے سامنے موجود رہتا ہے، مگر زندگی اس سے رخصت ہو کر دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی ہے کہ کیا کسی شے میں جان اور معلومات کا ہونا، منصب آدمیت پر پورا اترتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں کسی کے اندر موجود ہوں تو منصب آدمیت اور خلافت پر پورا اترنے کیلئے یہ دو چیزیں کافی نہیں ہیں۔ یہ معلومات چار ماہ تک رہتی ہیں۔ چار ماہ بعد کہ جب تمام جسمانی اعضا بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس قالب میں روح پھونک دیتے ہیں۔تو جب یہ ایام مکمل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس جسم میں روح ڈال دیتے ہیں۔ یہ نکتہ واضح کرتے چلیں کہ قرآن میں ایک دن پیائش پچاس ہزار

سال بیان کی گئی ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ جہاں انسان کی پیدائش کے حوالے سے ایام کا تذکرہ ہے، وہاں پچاس ہزار سال والے دن کی بات ہورہی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ انسان کے جسم کا آغاز ہے۔ یہاں سے آدم کا آغاز ہوتا ہے، کیوں کہ اب اس کے جسم میں روح داخل ہو چکی ہے۔

انسان کا مادی یا ظاہری جسم ''جسم حیوانی'' کہلاتا ہے۔ یہ کثیف ہوتا ہے۔جسم حیوانی کی کچھ مخصوص ضروریات ہوتی ہیں جن میں سب سے نمایاں غذا، نیند اور جنس ہے۔ اگر صرف اس جسم کی حد تک بات کی جائے تو انسان کا یہ جسم کسی حیوان کے جسم کی طرح ہے کہ جیسے ایک جانور یا حیوان کو اپنی بقا اور ارتقا کیلئے غذا، نیند اور جنسی عمل کی ضرورت ہے، ایسے ہی انسان کا مادی یا ظاہری وجود یعنی جسم حیوانی ان تینوں چیزوں کی مدد سے اپنی بقا اور نمو کا انتظام کرتا ہے۔

لیکن، ان تینوں ضروریات کے قوانین جانور پر لاگو نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس کا جب جی چاہے، جہاں جی چاہے، جو جی چاہے، کھاتا پیتا ہے... اس کا جب جی چاہے، جہاں جی چاہے، پڑ کر سوجاتا ہے... اس کا جب جی چاہے، جہاں جی چاہے، جس سے جی چاہے، جسمانی تعلق قائم کر لیتا ہے۔

مگر جیسے ہی جسم حیوانی میں روح داخل ہوتی ہے، تمام کے تمام امور جو انسان انجام دیتا ہے، اس کا جسم حیوانی مخصوص قوانین کے تابع ہوجاتا ہے۔ اس پر دنیا اور آخرت کا قانون فوراً لاگو ہوجاتا ہے۔ اب یہ پابند ہے ان قوانین اور ضوابط کا۔ لہٰذا، اب یہ اپنی مرضی جو چاہے، جہاں چاہے، کھا پی نہیں سکتا... اب یہ جہاں جی چاہے، جب جی چاہے، نیند نہیں لے سکتا... اب یہ جس سے چاہے، جہاں چاہے، جب چاہے، جنسی تعلق استوار نہیں کر سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اب یہ محض ''جسم حیوانی'' نہیں ہے، روح بھی رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے جوڑے بنائے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔

سکون حاصل کرنے کا مطلب ہے کہ تم ان سے ایک تعلق، ایک رشتہ قائم کرو اور پھر اپنی نسلوں کو آگے بڑھاؤ۔ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ مرد گناہ کرے گا، اسے گناہ ملے گا، عورت گناہ کرے گی، اسے گناہ ملے گا۔ مرد اور عورت میں سے جو بھی نیکی کرے گا، اسے اجر ملے گا اور برابر ملے گا۔ دونوں اپنی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں برابر ہیں۔ ان میں صنف کے اعتبار سے کوئی تفریق نہیں ہے۔ ہاں، یہ فرق شروع ہوتا ہے سماجی اور معاشرتی سطح پر کہ جب ایک مرد اور عورت مل کر ایک ’خاندان‘ کی شروعات کرتے اور یہ تعلق ’’میاں‘‘ اور ’’بیوی‘‘ میں تبدیل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں، ان دونوں کے دو مختلف کردار (Role) کی وجہ سے ان کی ذمے داریوں میں فرق ہوتا ہے، نہ کہ درجات میں۔ اور، یہ فرق محض اس دنیا کا نظام بہتر طور پر چلانے کیلئے تشکیل دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ

یعنی ہم نے تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تمہاری شناخت ہو سکے۔

(سورۃ الحجرات، آیت 13)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ مستحکم اور مضبوط معاشرہ قائم ہو۔ اس کا مقصد انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف جانا ہے۔ روح کی صورت میں، ہم انفرادی حیثیت میں تھے اور جب جسمانی وجود اختیار کیا تو اب ہمیں مل کر انسانی ملاپ سے ایک معاشرہ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اسلام کی جتنی تعلیمات ہیں، ان پر غور کر لیجیے کہ وہ کوئی سی عبادت ہو، اس میں اجتماعیت کی بات کی جاتی ہے۔ مثلاً اسلام کی ابتدا اس شہادت سے ہوتی ہے کہ اشہدان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ ... اور یہ اقرار سب کے سامنے کرنا ضروری ہے۔ نیز، اس اقرار کے بعد دوسروں کے پاس جا کر اُن تک اس کلمے کو پہنچانا بہ حیثیت مسلمان میری ذمے داری ہے۔ میں اگر مرد ہوں تو مجھے گھر سے نکل مسجد میں جا کر نماز

پڑھنی پڑے گی، کیوں کہ ہمیں انفرادیت نہیں، اجتماعیت قائم کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ہمیں یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ اگر تم کسی کو زیادہ نہیں، نمک، پانی یا کھجور ہی سے روزہ افطار کرا سکتے ہو تو ضرور کراؤ، کیوں کہ اس سے اجتماعیت کی ترغیب ملتی ہے۔ ایسے ہی زکوٰۃ کا معاملہ ہو، حج کی ادائیگی ہو، جمعہ کی نماز ہو یا عید کی نماز ہو، غرض کوئی عبادت ہو، مشیت خداوندی یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم دوسرے انسانوں سے ہم آہنگی پیدا کریں تا کہ اس دنیا میں محبت اور یگانگت قائم ہو اور یہ کرۂ ارض پُرامن ہو۔ ربِ کائنات نے ہر انسان کی ضروریات کو دوسرے انسانوں سے مربوط کر دیا ہے۔ لہٰذا، اس دنیا کا نظام تبھی چل سکتا ہے کہ جب ہر انسان اصول کو سمجھے اور خود کو دوسروں کی مدد اور تعاون کیلئے کمربستہ رکھے۔

دوطرح کے قوانین

پوری کائنات میں دوطرح کے قوانین ہیں۔ ان دوطرح کے قوانین کی بنیاد اصلاً دو اقسام کے علوم پر ہے۔

پہلی قسم کے قوانین وہ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کو نبوت عطا کرتے وقت عطا کیے گئے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ تمہاری طرف ایک سلسلہ ہدایت آتا رہے گا جو تمہیں گاہے گاہے رہ نمائی کرتا رہے گا۔ قرآن پاک کی درج ذیل سورہ میں اس علم کی طرف اشارہ ہے:

اللّٰهُ يَجْتَبِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ

ترجمہ: اللہ جسے چاہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے راہ دکھاتا ہے۔ (سورہ شوریٰ،13)

یہ علم، ''علم وحی'' یا ''علم وہبی'' کہلاتا ہے۔ اللہ عزوجل کی طرف سے خاص لوگوں کو خاص طور پر عطا ہوتا ہے۔ اس علم کیلئے اللہ تعالیٰ مخصوص لوگوں کو منتخب کرتا ہے۔ اسلامی عقائد کے مطابق، دنیا میں اللہ تعالیٰ نے چار الہامی کتابیں نازل فرمائی ہیں:

توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی

انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی

زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی

قرآن حکیم خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام انسانوں کی ہدایت کیلئے مبعوث فرمائے، جن میں سے بعض پر کتابیں نازل ہوئی اور بعض پیغمبروں کو صحیفے دیے گئے۔ صحیفوں کی تعداد کم وبیش 100 ہے، جن میں سے 10 صحیفے حضرت آدم علیہ السلام پر اترے، 50 صحیفے شیث علیہ السلام پر، 30 صحیفے حضرت ادریس علیہ السلام پر اور 10 صحیفے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اترے۔ جبکہ مشہور آسمانی کتابیں درج بالا چار ہیں۔

تاہم، تمام انبیا کے آخر میں، جب آں حضرت ﷺ تشریف لائے تو باقی تین الہامی کتابیں اور تمام صحائف میں بیان کی گئی تعلیمات کو اللہ کے حکم سے منسوخ ہوگئیں۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ کی بعثت کے بعد سے قیامت تک صرف اور صرف ''قرآن'' اور اس قرآن کے معلم آں حضرت ﷺ کے اقوال وافعال ''حدیث وسنت'' ہی علم وہبی کے طور پر مسلمہ قرار پائیں گے۔

قوانین کی دوسری قسم عقل ہے... وہ اسما جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو سکھائے تھے۔ انسانی عقل مکلف ہے۔ عقل ہی انسان کے بناؤ اور بگاڑ کی ذمے دار ہے۔ عقل اور شعور کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اسی پر دنیا اور آخرت کا قانون لاگو ہوتا ہے۔ جس انسان کے پاس شعور نہیں ہے، وہ قانون پر عمل داری کا مکلف ہی نہیں ہے۔ اس لیے اسے دنیا سزا دے سکتی ہے اور نہ آخرت میں سزا ہے۔ چنانچہ یہ عالمی قانون ہے کہ سزا اس فرد کو دی جائے گی جو عاقل یعنی عقل رکھتا ہو۔

مثال کے طور پر، اگر ہمارے پاس کوئی شخص اپنا نفسیاتی مسئلہ لے کر آ جائے اور ہم اسے نفسیاتی مریض قرار دے دیں اور ایک مخصوص لیٹر لکھ کر دے دیں... اور اب وہ کوئی غیر قانونی کام کر بیٹھے تو دنیا کے کسی بھی ملک کا قانون اسے سزا وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ایسے ہی بڑے سے بڑے مفتی کے پاس چلے جائیے اور اسے بتائیے کہ فلاں نفسیاتی مریض نے یہ گناہ کیا ہے تو وہ مفتی اس پر کوئی حد جاری نہیں کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسما سکھا کر یہ چاہا کہ ہم اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے قانون سازی کریں گے۔

گویا، قانون بنانے کیلئے دو طرح کے علوم انسان کیلئے ضروری ہیں۔ اول، علم وحی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخصوص اوقات میں مخصوص بندوں کے ذریعے بھیجا گیا جنھیں ہم نبی اور رسول کہتے ہیں۔ دوم، علم کسبی یعنی acquired knowledge جو ہم مختلف اداروں میں جا کر سیکھتے ہیں، جیسے ہم انجینئر یا ڈاکٹر بنتے ہیں، بزنس یا اکاؤنٹس سیکھتے ہیں، نفسیات یا قانون پڑھتے ہیں... یہ تمام علوم کسبی ہیں کیوں کہ یہ ہم اپنی عقل سے حاصل کرتے ہیں۔

انھی دو علوم کی بنیاد پر انسانی زندگی چلنی چاہیے۔ یا تو اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے علم کی بنیاد پر زندگی گزاروں گا یا پھر جہاں ضرورت پڑے گی، اسی الہامی علم کی روشنی میں اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے کچھ ضمنی قوانین (By laws) تیار کریں گے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ علم وحی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف اور صرف اپنی عقل پر بھروسا کروں گا اور عقل سے جو کچھ درست لگتا ہے، اسی پر قانون پر عمل کروں گا۔

علم کسبی کی حدود

اب ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔

مجھے ذرا بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا کا ایک مرد عورتوں کیلئے کوئی قانون بنائے اور

پوری دنیا کی خواتین اس قانون کو تسلیم کر لیں؟ یا ایک عورت مردوں کیلئے کوئی قانون بنائے اور دنیا کی تمام عورتیں اُسے مان لیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا کی تمام مائیں مل کر ایک قانون بنائیں اور دنیا بھر کے باپ اس قانون کو مان لیں؟ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ دنیا بھر کے حکام مل کر ایک قانون بنائیں اور دنیا بھر کی تمام عوام اس قانون کو تسلیم کر لے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ تمام عوام مل کر ایک قانون بنائے اور تمام حکمراں وہ تسلیم کر لیں؟ ایسے ہی آجر اور اجیر پر اس سوال کو لاگو کر کے دیکھ لیجیے۔ میاں بیوی پر آزما کر دیکھ لیں۔ افسر اور ماتحت پر اسے لاگو کر کے آزما لیجیے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک فرد خواہ اس کا تعلق کسی شعبہ حیات سے ہو، وہ کسی کیلئے قانون بنائے اور اس قانون کو دنیا کی ہر قوم، ہر نسل اور ہر مذہب کے ماننے والے تسلیم کریں۔ آج تک ایسا نہیں ہوسکا۔

اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ کوئی ایسا قانون وجود رکھتا ہو جو ہر ایک کیلئے قابل قبول اور قابل عمل ہو۔ اس کا حل بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا۔

اسلام، پسندیدہ ترین قانون

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

(سورۃ آل عمران، 9)

ترجمہ: میں نے اسلام کو تمہارے لیے بہ طور دین پسند کر لیا ہے۔

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

(سورۃ المائدہ، 3)

ترجمہ: اور میں تمہارے لیے اسلام کو بہ طور دین راضی ہوا۔

اس کی سب سے بڑی عقلی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے، یہ ہے کہ اسلام کو ماننے والا

یعنی مسلمان پوری دنیا کی ہر مخلوق، چرند پرند، چوپاؤں سمیت ہر انسان کیلئے باعث سلامتی ہے۔ یہ خوبی صرف اور صرف علم وحی یا قانونِ الٰہی میں ہے کہ ہر آدمی کی عین ضروریات کے مطابق اسے قوانین فراہم کردیے گئے۔ اب وہ انسان کسی بھی کردار میں ہو... مرد ہو یا عورت، حاکم یا عوام، میاں ہو یا بیوی، والدی ہیں یا مالک، مالک ہے یا ملازم، آجر ہو یا اجیر، خادم ہے یا مخدوم، افسر ہے یا ماتحت... اسے اپنے کردار کے مطابق قانون فراہم کردیا گیا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں وہ تین خوبیاں ہیں جو کسبی احکام (انسان کے بنائے ہوئے قوانین) میں نہیں ہیں۔

اول اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کو تخلیق کیا لہٰذا وہی ہمیں سب سے بہتر جانتا ہے اور کوئی ذریعہ نہیں انسان کو جاننے اور اس کی ضروریات کو پہچاننے کا۔

دوم اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے اسی کی ضروریات کے عین مطابق کتابیں بھیج دیں تاکہ انھیں تحریری صورت میں احکام مل جائیں۔

سوم اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ رسول اور سوا لاکھ کے قریب انبیا بھیجے تاکہ لوگ یہ سیکھ بھی جائیں کہ ان احکام پر عمل کیسے کرنا ہے۔ گویا، تحریری احکام کے ساتھ ساتھ عملی نمونے (Role Model) بھی اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی بھیج دیے۔ اور برسبیل تذکرہ، ہم جیسی کمزور امت کیلئے خاتم الانبیا حضرت محمد ﷺ کی صورت میں اکمل (پرفیکٹ) نمونہ بھی بھیج دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی عقل سے بالکل کام نہ لے، وہ کچھ بھی سوچ سمجھ نہ سکے، تب بھی اس کے پاس وحی کی صورت میں ایک مکمل قانون اور ضابطہ موجود ہے۔

یہاں ایک عام غلط فہمی خاص کر پڑھے لکھے تعلیم یافتہ طبقے میں یہ پیدا ہوگئی کہ جب ہمارے پاس عقل موجود ہے تو ہمیں علم وحی سے اکتساب کی ضرورت کیا ہے۔ یہ غلط فہمی اس

لیے پیدا ہوئی کہ انسان نے ہر علم وفن اور ہر شے کو اپنی عقل سے تولنا اور ناپنا شروع کردیا۔ انسانی مزاج ہے کہ وہ جس شے کے بارے میں کچھ سمجھ نہیں پاتا تو اس پر اپنی عقل دوڑانا شروع کردیتا ہے۔ لیکن، یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جیسے انسان کے دو بنیادی وجود ہیں، مادی جسم اور روحانی جسم، ایسے ہی عقل کی حدود بھی مادی جسم پر ختم ہوجاتی ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پہلے ہی یہ بتادیا کہ تمہاری عقل جہاں تک کام کرے گی، اسے استعمال کرو، اس لیے عقل کا استعمال منع نہیں ہے اور نہ عقلی علوم جیسے سائنس وغیرہ کا سیکھنا ناجائز نہیں ہے، مگر اس کی حد ہے۔

ایسے ہی روحانی اور الہامی علوم کا بھی خاص دائرۂ کار ہے۔ یہ دوطرفہ غلطی ہے۔ کیسے؟

ایک جانب تو سائنس سے وابستہ لوگوں نے سائنسی ضابطوں کے ذریعے روح اور روحانی علوم و معارف کو سمجھنے کی بہت بڑی غلطی کی تو دوسری جانب قرآن سے محبت کرنے والوں نے (قرآن کا اصل مقصد سمجھے بغیر اپنی دانست میں) قرآن سے ریاضی کے فارمولے نکالنے اور سائنسی دریافتیں کرنے کی فاش غلطی کی۔ یاد رکھیے، سائنسی علوم خواہ کتنی ہی ترقی کرجائیں، وہ علوم وحی کی خاک کو نہیں پہنچ نہیں سکتے۔ قرآنی علوم کا دائرۂ کار انسان کی روح ہے نہ کہ سائنسی فارمولے اخذ کرنا اور کسی واقعے کی پیشین گوئی کرنا۔ یہ مزاج قرآن کریم کی مقصد اصلی کے خلاف ہے، اور اس کی توہین کے مترادف ہے۔

واضح رہے، قرآن کا اصل مقصد ''ہدایت'' ہے۔ اور، اس ہدایت کی روشنی میں اپنی زندگی کو تشکیل دینا ہے۔

اب میں واپس زوجین یعنی میاں بیوی کے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ جب ایک مرد اور عورت آپس میں ملتے ہیں تو وہ بھی اسلام کی رُو سے ایک دوسرے کیلئے انتہائی سلامتی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے ان کیلئے بھی قانون ہے کہ مرد اور عورت جب ایک دوسرے سے ملیں اور ایک خاندان کی بنیاد رکھیں تو کن قوانین اور ضابطوں کی پابندی کرنا ہوگی۔ اب

سوال یہ ہے کہ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میں کیسے اپنے لیے بیوی کا انتخاب کروں۔ اور مجھے کون بتائے گا کہ مجھے اپنی بیوی سے کیسے تعلق قائم کرنا ہے۔ جیسے ہی مرد اور عورت آپس میں ملتے ہیں اور میاں بیوی بنتے ہیں تو برابر نہیں رہتے۔ یاد رکھیے، میاں بیوی برابر نہیں ہوتے۔ ماں اور باپ برابر نہیں ہوتے۔ بہن بھائی برابر نہیں ہوتے، حتیٰ کہ دو بھائی برابر نہیں ہوتے۔ ایک بڑا ہوتا ہے اور دوسرا چھوٹا ہوتا ہے۔ اب میاں بیوی ہوں، ماں باپ ہوں، بہن بھائی ہوں یا چھوٹے بڑے بھائی... ان سب کے فرائض اور حقوق واضح اور متعین ہیں۔ اور اس رُو سے یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے، کیوں کہ دونوں کرداروں کے فرائض اور حقوق الگ الگ ہیں۔ ان کے درمیان فرق ہے۔

مغرب میں فتنے اور فساد کا بہت بڑا سبب یہی بنا کہ انھوں نے کرداروں (Roles) کو برابر سمجھنا شروع کر دیا۔ وہ اس مخمصے میں پڑ گئے کہ چونکہ مرد اور عورت برابر ہیں، اس لیے میاں بیوی بھی برابر ہیں۔ اس منطق سے سوائے فساد کے اور کچھ نہیں ہوا۔

اگلی بات یہ کہ جب میاں بیوی کچھ عرصے ایک خاندان کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہیں تو ان کی اولاد ہوتی ہے، پھر اس اولاد کی اولاد ہوتی ہے۔ یوں، معاشرہ ترقی پذیر رہتا ہے۔ جب چند گھر آپس میں جڑتے ہیں تو وہاں سب کردار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان کرداروں کو خوش اسلوبی سے نباہ کرنے کیلئے کچھ قوانین کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر قانون نہیں ہوگا تو جس کا جو جی چاہے گا، وہ کرے گا۔ قانون سازی کرنے کیلئے دو ہی منابع ہیں جو پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں... علم وحی اور علم کسبی۔

عورت اور مرد؛ حقوق اور فرائض کا فرق

ہمارے ہاں مغرب زدگی سے متاثرہ مسلمان یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق میسر نہیں ہیں۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جو باقاعدہ منظم سازش کے

تحت مسلم معاشروں میں تعلیم یافتہ طبقات بالخصوص مسلم خواتین میں پھیلائی گئی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کے نام نہاد جدت پسند مسلمان جو خود کو Liberal یا Modest کہلوانا پسند کرتے ہیں، انھوں نے اسلام کو مغربی دانش وروں اور مستشرقین کی تحریروں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ قرآن کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ قرآن کو پڑھا اور سمجھا جائے۔ اس وجہ سے Feminism اور Women Rights جیسی تحریکیں پروان چڑھیں جنھوں نے حقوقِ نسواں کے نام پر خواتین کو جری بنا دیا اور وہ اپنی فطرتِ سلیمہ سے ہٹ گئیں۔ اس کے نتیجے میں، معاشروں میں جو بگاڑ پیدا ہوا ہے، وہ سب کے علم میں ہے۔ بہ ہر کیف، ان غلط فہمیوں کی بنیاد ''حقوق'' اور ''فرائض'' کے درمیان فرق کو نہ سمجھنا ہے۔

اس دنیا میں دو طرح کے انسان ہیں: مرد اور زن (عورت)۔ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ چونکہ ان دونوں کی فطرت اور مزاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، لہٰذا ان دونوں کی ذمے داریاں اس دنیا میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ذمے داریوں کا فرق آدمی کے کردار کو مختلف بناتا ہے۔ یہاں تک ہو سکتا ہے کہ ایک مرد ایک مقام پر اپنی مخصوص ذمے داریوں کی وجہ سے ایک خاص کردار کی شناخت رکھتا ہو اور دوسرے مقام پر اپنی ذمے داریوں میں فرق کی بنا پر دوسرا کردار ادا کرتا ہو۔ جیسے میں، اگر اپنے دفتر میں ہوں تو یہاں میری ذمے داریاں میرے دفتری کردار کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ لیکن جب میں اپنے گھر پر ہوتا ہوں تو میں ایک شوہر اور باپ کا کردار ادا کرتا ہوں، کیوں کہ وہاں میں ایک افسر نہیں، بلکہ ایک شوہر یا باپ ہوں۔ چنانچہ میری ذمے داریاں بھی شوہر اور باپ کی ہوں گی۔ اور، مجھے گھر پر اپنی ذمے داریوں کی روشنی میں اپنے عمل کا تعین کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں حقوقِ نسواں کی جو تحریکیں چلیں، ان کی بنیادی غلطی یہی رہی کہ انھوں نے

کردار اور فرائض کے فطری اور لازمی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ جبکہ حقوق کے نعرے لگائے گئے۔ اس سے معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان دوریاں بڑھیں تو رنجشوں میں اضافہ ہوا۔

قرآن جب مرد اور عورت کی بات کرتا ہے تو ان دونوں کے فطری کرداروں کی قانون سازی بہت واضح طور پر کرتا ہے۔ یوں کہیے کہ ضرورت اور وقت کے تقاضے کے مطابق، جب تعین ہو جائے گا کہ کون کیا کردار ادا کرے گا تو اب ہر کردار کے مطابق اس کیلئے ضروری ہے کہ اس کیلئے جو قانون وضع کیا گیا ہے، اس پر وہ عمل کرے۔ یعنی ہر فردِ معاشرہ، خواہ وہ حاکم یا عوام، میاں ہے یا بیوی، والدی ہیں یا مالک، مالک ہے یا ملازم، آجر ہو یا اجیر، خادم ہے یا مخدوم، افسر ہے یا ماتحت... اسے اپنے کردار کے مطابق اپنی ذمے داریاں ادا کرنی ہوں گی۔

اب دوسرا پہلو آتا ہے... حقوق کا۔ اس معاملے میں انصاف کی بات کی جائے، برابری کا تقاضا کیا جائے گا۔ اور قرآن اس معاملے میں واضح اعلان کرتا ہے کہ...

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ

ترجمہ: اور دستور کے مطابق ان کا ویسا ہی حق ہے جیسا ان پر ہے۔

(سورہ بقرہ،228)

یعنی عورتوں کیلئے بھی مردوں پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کے عورتوں پر ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد تو جو چاہے، کرتا پھرے، اس کی سرزنش کیلئے کوئی قانون نہ ہو، مگر عورت کو اپنی بنیادی انسانی ضروریات پوری کرنے کی اجازت بھی نہ ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کو ان کے حقوق کے معاملے میں برابر کیا ہے۔ امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: حُقُوقِ زوجیّت میں سے عورتوں کے حُقُوق مَردوں پر اُسی طرح واجب ہیں جس طرح مردوں کے حُقُوق عورتوں پر واجب ہیں۔

لیکن جب میاں بیوی کی حیثیت سے ہوتے ہیں تو اس کیلئے ضابطہ کچھ مختلف ہے۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا:

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

ترجمہ: اور مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے۔ (سورہ بقرہ،228)

اس ''فوقیت'' کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''جاہلیت کے دَور میں عورت کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ اس آیت نے بتایا کہ شوہر اور بیوی کے حقوق ایک دوسرے کے برابر ہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ زندگی کے سفر میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو امیر اور نگراں بنایا ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے سورۂ نسا (آیت 34) میں واضح فرمایا ہے۔ اس لحاظ سے اس کو ایک درجہ فوقیت حاصل ہے۔''

یہ فوقیت بھی عین فطری ضرورت ہے، کیونکہ دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا ادارہ بھی اس وقت تک چل نہیں سکتا جب تک وہاں عہدوں اور اختیارات کی تفویض سلسلہ وار نہ ہو۔ حتیٰ کہ دنیا کے ہر ملک کے سیاسی اور انتظامی معاملات بھی اسی طریقے کے مطابق انجام دیے جاتے ہیں۔ جہاں وزیراعظم اور صدر، سمیت ہر ایک کی درجہ بندی واضح ہوتی ہے اور ان کے درمیان اختیارات اور ذمے داریاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مینجمنٹ کی اصطلاح میں اسے hierarchy کہا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اختیارات مرد کو دیے گئے ہیں، عورت کو نہیں دیے گئے۔ اور، بعض اختیارات عورت کے پاس ہیں تو مرد کو نہیں ملے۔ مثال کے طور پر، مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے، عورت کو طلاق کا حق نہیں ہے۔ جن ممالک میں مرد اور عورت دونوں کو طلاق کا اختیار حاصل ہے، وہاں وہ کہتے ہیں کہ دونوں برابر ہیں۔ یہ بات قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ مجھے یہاں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہاں لفظ ''فوقیت'' سے مراد ''فرق'' ہے۔

کیوں کہ مرد اور عورت کے مزاج میں فرق ہے، لہٰذا ان کی ذمے داریوں میں بھی فرق ہے۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیت اس پہلو پر بہتر روشنی ڈالتی ہے۔ قرآن کریم میں اس موضوع پر ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ

ترجمہ: مرد، عورتوں کے نگراں ہیں۔ (سورۃ النسا، 34)

اس آیت میں قَوّٰامُوْنَ کا لفظ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ قوام، قیام، قیم عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا نظام کا ذمے دار، نگراں اور چلانے والا ہو۔

اُردو زبان میں بعض مترجمینِ قرآن نے لفظ قَوّٰام کو جوں کا توں باقی رکھا ہے۔ بعض نے اس کا ترجمہ حاکم، افسر، سرپرست یا سربراہ کیا ہے۔ تاہم اس سے اس کے پورے مفہوم کی وضاحت نہیں ہو پاتی۔ عربی زبان میں قَامَ کا ایک معنی نگرانی وخبر گیری ہے۔ قَامَ عَلَى الْاَمْرِ، یعنی کسی کام میں مشغول ہونا، کسی کام کو سنبھالنا؛ قَامَ عَلٰى اَهْلِه، یعنی اہل وعیال کی دیکھ بھال کرنا، کفالت کرنا، خرچ اٹھانا۔

عربی کے لغوی معنی کی رُو سے دیکھا جائے تو یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ مرد اپنی عورتوں پر گھر کے سربہ راہ ہیں اور ان کے نان نفقے، کپڑے لتے کی ضروریات پوری کرنے کی ذمے داری مردوں پر ہے۔

ہر اجتماعی نظام کیلئے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر اور حاکم ہو، تاکہ اختلاف کے وقت اس کے فیصلے سے کام چل سکے۔ جیسے ملک وسلطنت اور ریاست کیلئے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے، اسی طرح عائلی نظام میں جس کو ''خانہ داری'' کہا جاتا ہے، اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے۔ عورتوں اور بچوں کے مقابل ہمیں اس کام کیلئے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی فطری اور عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں اور بچوں کے زیادہ ہیں۔

جیسے ایک ادارے میں کوئی اعلیٰ عہدے پر ہے تو اس کے فرائض اور ذمے داریوں میں ماتحت عملے کے مقابلے میں فرق ہے۔ اگر کسی ادارے میں ہر ملازم کو Hire and Fire کا اختیار دے دیا جائے تو کیا وہ ادارہ پنپ سکے گا؟ لیکن، اس کا مطلب یہ نہیں کہ افسر اور ماتحت انسان کی حیثیت سے زیادہ یا کم ہیں۔ انسان کی حیثیت سے اُن کے حقوق برابر ہیں۔ اگر کوئی ظلم افسر کی جانب سے ماتحت پر کیا جائے گا تو افسر کی بھی سرزنش ہوگی۔ ایسے ہی جب معاملہ گھر کا آتا ہے تو ''خاندان ایک اہم ترین ادارہ ہے'' لہٰذا یہ ضروری تھا کہ یہ طے کر دیا جائے کہ کس کے پاس کیا اختیارات ہوں گے، کون افسر ہوگا اور کون ماتحت۔ لیکن، اس سے کسی کے برتر ہونے یا حقیر ہونے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دونوں کے حقوق انسان کی حیثیت سے برابر ہی ہیں، لہٰذا دونوں کی برابر کی باز پُرس ہوگی اور انصاف ملے گا۔

البتہ جہاں تک نکاح کے اہم ترین معاملات ہیں، مرد کے قوام ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی باگ ڈور مرد کے ہاتھ میں دی ہے۔

بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (سورۃ البقرہ، 237)

یہ مرد کے حوصلے پر اعتماد ہے۔ کیوں کہ مرد ذمے دار بنایا گیا ہے تو اب اس کی ذمے داری ہے کہ تمہیں اس خاندان کو چلانا ہے اور بچانا ہے۔ کیوں کہ تمہارے پاس اس نظام کی باگ ڈور ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی جیسے ایک گھر میں کئی بہن بھائی ہوں تو بڑے بھائی سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو، بیٹا تم ان سب میں بڑے ہو، اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا اور انھیں ساتھ لے کر چلنا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ دیگر بہن بھائیوں کو Degrade یا کم تر کیا جا رہا ہے، بلکہ کسی ادارے یا خاندان کے نظام کو چلانے کیلئے کسی ایک کو تو باقیوں کی ذمے داری سونپی جائے گی۔ ایسے ہی مرد کو گھر کا سربہ راہ بنا کر اس پر زیادہ ذمے داری ڈالی گئی ہے۔ یہ الگ معاملہ ہے کہ بعض مرد اس ذمے داری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اپنی

عورتوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔لیکن، یہ استثنا ہے، اس استثنا کو اوسط ضابطہ (General Rule) نہیں بنایا جاسکتا ہے۔

اب تک کی گفتگو میں ہم چند بنیادی باتیں کرآئے ہیں کہ

انسان دو پہلو رکھتا ہے: جسم   اور   روح

انسان زندگی گزارنے کیلئے جو ضابطہ اختیار کرتا ہے، اس کے منبع ہیں:

علم کسبی یا عقل   اور   علم وحی یا الہامی کتب

اگلا مرحلہ

ہم اب تک یہ جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا اور پھر آدم کو تمام اسما سکھائے۔ پھر آدم اور حوا کو زمین پر ایک پلان کے مطابق بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ہم یہ جانتے ہیں کہ مرد اور عورت ملے تو ان کے ملاپ سے ان کی نسلیں بڑھیں۔ نسل در نسل یہ سلسلہ چند ہزار سال سے آگے بڑھتا رہا اور ایک معاشرہ، محلہ، شہر، ملک وجود میں آئے۔ آج یہ حضرت انسان پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔

یہاں ہر انسان ایک فرد کی حیثیت سے آتا ہے اور کچھ نہ کچھ کرتا ہوا مخصوص وقت اس دنیا میں گزارتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بس، یہی سب کچھ ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی صناعی اور اتنا بڑا انظام صرف اسی لیے قائم کیا تھا کہ آدمی اس دنیا میں آئے، اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے اور پچاس سال، ساٹھ سال، ستر سال، اَسّی سال گزار کر مر جائے۔

اگرچہ بعض لوگ دل کی تسلی کو یہی کہتے ہیں اور ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں تو موت کے خوف کے باعث اسی پر اصرار کرتے ہیں کہ جناب، مر گئے تو سب کچھ ختم۔ لیکن، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب طفل تسلی ہے جو وہ خود کو تسلی دینے کیلئے اختیار کرتے ہیں۔

عقل بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اتنا بڑا انظام اور کارخانہ جو پوری کائنات کو چلا رہا ہے، وہ بغیر کسی مقصد کے ہوگا یا محض نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ نے اپنی تفریح کیلئے یہ سامان تخلیق کیا ہوگا؟ آپ جانتے ہیں کہ جو سسٹم جتنا بڑا ہوتا ہے، اتنا زیادہ اسے بنانے اور چلانے والے اس کیلئے فکرمند اور متردد ہوتے ہیں۔

چنانچہ آدم اس دنیا میں آیا ہے تو اسے واپس بھی جانا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب انسان کی تخلیق کی تو وہ پہلے روح کی حیثیت میں تھا۔ پھر ایک معین مدت کے بعد وہ روح کے ساتھ ساتھ جسمانی غلاف بھی چڑھا دیا گیا۔ اور پھر جسمانی وجود میں آنے کے بعد وہ اس دنیا میں آیا۔ اس دنیا میں آنے کے بعد چونکہ اُس کا اصلی وجود روحانی ہے، لہٰذا اسے اس مادی یا جسمانی وجود سے واپس روحانی وجود کی طرف منتقل ہونا ہے۔ روحانی وجود کی طرف منتقلی وہی عمل ہے جسے ہم ''انتقال'' کہتے ہیں۔

انتقال کے بعد آدمی جسمانی دنیا سے منتقل ہو کر خالصۃً روحانی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ یاد رکھیے کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے، اسے واپس روحانی دنیا میں منتقل ہونا ہے۔ یہ قدرت کا ضابطہ ہے۔ اس کائنات کا خالق انسان کو ''ابدیت'' دینا چاہتا ہے۔ لیکن، یہ ابدیت، اس طبیعی اور مرئی دنیا میں مقدر نہیں ہے۔ کوئی بھی... حتیٰ کہ انبیا اور رسل بھی... اس ضابطے سے مبرا نہیں ہیں۔ جسم کا انتقال ہر نفس کیلئے لازم ہے... جلد یا بدیر... کچھ عرصے میں یا زیادہ عرصے میں... جو بھی اس دنیا میں آیا ہے یعنی پیدا ہوا ہے، اسے اس دنیا سے جانا ہے یعنی مرنا ہے۔ ہر جان دار کو واپس اپنے اصل مقام کی طرف جانا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (سورۃ آلِ عمران، آیت 85)

پانی میں موت ہوئی ہے تو پانی میں گھل جاؤں گا۔ مٹی پر موت ہوئی ہے تو مٹی بن جاؤں

گا۔ آگ سے خدانہ خواستہ جل گیا ہوں تو راکھ بن جاؤں گا۔ موت کی جو بھی صورت ہو، آدمی کی یہ ہیئت صرف مادی جسم کے اعتبار سے ہے۔ لیکن، روحانی حیثیت سے اپنا وجود باقی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ہم زندہ ہیں اور جب مریں گے تو یہ سب منتقلی کا عمل چل رہا ہے۔ یہ سفر ہے جو حضرت انسان نے شروع کیا ہے۔ یہ سفر انسان کی تخلیق سے شروع ہوا تھا اور جنت یا جہنم میں جانے تک جاری رہے گا۔

یہاں یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہیے کہ کون لوگ اپنے سفر ہی کو اپنی منزل سمجھ بیٹھتے ہیں اور کون ہیں جو لوگ ہیں جو بہترین سفر کو بھی اپنی منزل نہیں سمجھتے۔ میں چونکہ بین الاقوامی سفر بہت زیادہ کرتا ہوں تو ہم نے دنیا کے مختلف ایر پورٹس پر دیکھا کہ وہاں بہترین Transit Lounge موجود ہیں۔ بعض لاؤنجز میں تو وہ سہولتیں دستیاب ہیں جو امیر سے امیر آدمی کے گھر پر بھی اسے میسر نہیں ہیں۔ شاید ہی عام آدمی ان سہولیات اور تعیّشات کا تصور کر سکے... اس کے باوجود کوئی بھی مسافر اس آرام اور آسائش میں کھو نہیں جاتا۔ وہ اس تشویش میں رہتا ہے کہ کہیں میری فلائٹ نہ رہ جائے۔ اسے اتنے آرام و آسائش کے ماحول میں بھی مزہ نہیں آتا، اس لیے کہ اسے اپنے گھر پہنچنا ہے۔ وہ تمام راحتیں صرف اس لیے خوشی خوشی چھوڑنے کو تیار ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا ہے۔

یہ ایک عام مثال ہے اس دنیا کے عام مسافر کی۔ اب ذرا اس کے دوسرے پہلو پر بات کر لیتے ہیں۔

کون ہے جو سفر ہی میں رہنا چاہے گا... اور گھر جانے سے پہلو تہی برتے گا؟

اگر مسلمان موت سے ڈرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ اسے اپنے گھر کیوں نہیں جانا۔ بات بہت واضح ہے۔ میرے خیال میں، میں نے کوئی گہری یا مشکل بات نہیں کی۔ اس کے برعکس، جب مسلمان موت کا طلب گار ہوتا ہے، شہادت کا خواہش مند ہوتا ہے اور اپنے خالق سے ملاقات کیلئے بے چین ہوتا ہے تو اسے پتا ہے کہ وہ

کیوں اس دنیا سے جانے کیلئے اتنا بے تاب ہے۔

ہمیں یہ تو پتا چل گیا کہ ہمیں اپنے گھر جانا ہے، کیوں کہ ہم سفر میں ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمیں اگر گھر جانا ہے تو گھر (یا منزل) پر پہنچنے سے پہلے دورانِ سفر کیا ہے؟

آیئے، سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں کہ موجودہ دَور تک سائنسی تحقیقات انسان کی پیدائش اور اُس کی تمام مخلوقات میں افضلیت کو کیسے ثابت کرتی ہیں۔

روحانی دنیا سے طبیعی دنیا کو منتقلی

انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی حسین ترین تخلیق قرار دیا ہے اور جس کیلئے کارخانہ عالم کو مزین کیا، خود رب العزت کے ارشاد کے مطابق ایک حقیر قطرے سے وجود میں آیا۔ یہ حقیر سا قطرہ کیا ہے؟ مادۂ حیات کا ایک حصہ جس میں کروڑوں نطفے حرکت کرتے ہوئے بیضہ دانی تک پہنچتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کو بیضے کے مرکز تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

آج اس دنیا میں جتنے انسان مختلف علاقوں، مختلف بولیوں، مختلف رسوم ورواج اور مختلف نظریات وعقائد کے نظر آتے ہیں ان سب کی پیدائش اور تخلیق یکساں ہے......مرد او عورت کا آپس میں ملنا، اس کے نتیجے میں استقرارِ حمل، رحم مادر میں جنین کی تشکیل اور پھر چند ہفتوں بعد رحم مادر سے اس دنیا میں آمد!

یہ تمام عمل سائنسی زبان میں ''تولیدی عمل'' (Reproductive System) کہلاتا ہے اور اتنا آسان اور سادہ نہیں جتنا کہ اوپر کے پیرے میں بیان کر دیا گیا۔ استقرارِ حمل ایک ہوش رُبا اور حیران کن داستان ہے جو آج بھی خالقِ ارض وسماں اور مالکِ انس وجن کی موجودگی اور اس کی قدرت کی گواہی دیتی ہے۔ یہ تولیدی عمل درختوں، پودوں، حیوانوں اور انسانوں سب میں جاری ہے جس کے ذریعے وہ اپنی تعداد کو بڑھاتے اور اپنی

نسل کو آگے چلاتے ہیں۔

انسان کے اس دنیا میں آنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ اس کی پیدائش ہے۔ پیدائش کا عمل بھی انتہائی طویل اور پیچیدہ ہے اور انسان اپنی ہی پیدائش کے اس عمل کو ہمیشہ سے سمجھنے کیلئے متجسس رہا ہے۔ جدید ترین سائنسی تحقیقات اور آلات کے نتیجے میں آج ہم جس تفصیل سے انسانی تخلیق کے مراحل کو جاننے اور سمجھنے کے قابل ہیں، اس سے پہلے ممکن نہ تھا۔ انسان شناسی کے موضوع کے حوالے سے، کہ جو اس کتاب کا اصل نکتہ بحث ہے، میں انسان کی تخلیق کے مراحل کو مختصر تذکرہ مناسب خیال کرتا ہوں۔

جب مرد اور عورت آپس میں ملتے ہیں تو اس دوران تقریباً دو سو پچاس ملین کرم منی (Sperms) خارج ہو کر مخصوص راستے سے تیزی سے سفر کرتے ہوئے عورت کے بیضہ (Ovum) تک جا پہنچتے ہیں۔ ان ڈھائی سو کے لگ بھگ کرم میں سے صرف ایک ہزار اس سفر میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس پانچ منٹ کے سفر کے بعد بیضہ، جس کا حجم تقریباً نمک کے ایک ذرے کے نصف کے برابر ہوتا ہے، صرف ایک کرم منی کو اپنے اندر آنے دیتا ہے۔ چنانچہ آدمی کا جوہر اس کا سارا مادۂ تولید نہیں، بلکہ اس کا ایک انتہائی چھوٹا حصہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس جانب اشارہ ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى () أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ()

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ اس منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو (ماں کے رحم میں) ٹپکایا جاتا ہے؟

(سورۃ القیامہ، آیت 36، 37)

قرآن ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ انسان پورے مادۂ تولید سے نہیں بنایا گیا، بلکہ اس کے ایک چھوٹے سے حصے سے وجود میں آیا ہے۔ اس بیان میں اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے جو سائنسی دریافت ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کا بیان الہامی ہے۔

مادۂ تولید کا آمیزہ

سیال جو مادۂ تولید کہلاتا ہے اور جس میں کرم منی پائی پائے جاتے ہیں، صرف کرم ہائے منی پر مشتمل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس یہ مختلف مائع جات کا آمیزہ ہوتا ہے۔ ان مائع جات کے مختلف کام ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کرم منی کیلئے توانائی فراہم کرنے والی شکر کی فراہمی، رحم مادر کے دہانے پر تیزابیت میں کمی اور کرم منویہ کی حرکت میں آسانی کیلئے مناسب ماحول کی تیاری۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب قرآن میں مادۂ تولید کا ذکر آتا ہے تو مادۂ تولید کا ذکر آمیزے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جدید سائنس بھی یہی بات ثابت کرتی ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ

ترجمہ: بے شک، ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے پیدا۔ (سورۃ الدہر، 2)

ایک دوسری آیت میں دمادۂ تولید کا ذکر پھر آمیزے کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو اس آمیزے کے نچوڑ سے تخلیق کیا گیا۔

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ()
ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ()

ترجمہ: اس نے جو چیز بھی پیدا کی، اسے خوب بنایا، اور انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر، اس کی نسل ایک نچوڑے ہوئے حقیر پانی سے چلائی۔

(سورہ سجدہ، آیت 7،8)

عربی لفظ سللة جس کا ترجمہ یہاں ''نچوڑ'' کیا گیا ہے، کا مطلب کسی چیز کا ضروری یا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ کسی بھی طرح، اگر اس کے معنی پر غور کیا جائے تو اس کا مطلب ''کل کا جز'' ہی نکل سکتا ہے۔ زیادہ عوامی زبان میں اسے اگر میں ''ست'' (Extract) کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو انسان کی تخلیق کے مراحل کو انتہائی ابتدا سے اور گہرائی کے ساتھ جانتا ہے۔

بچے کی جنس

ایک زمانے تک بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انسانی تاریخ کے کئی ہزار برس تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ بچے کی جنس کا تعین ماں سے ہوتا ہے۔ آج بھی جہلا کے ہاں، خاص کر ہندوانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ گھر میں لڑکی کی پیدائش پر اُس کی ماں کو منحوس اور قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ لیکن، قرآن کا کہنا ہے کہ بچے کی مردانہ یا زنانہ خصوصیات کا تعین مادۂ تولید کے ایک قطرے سے کیا جاتا ہے۔

وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ () مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ()

ترجمہ: اور یہ کہ اسی نے جوڑا نر اور مادہ کا پیدا کیا ہے۔ ایک بوند سے جب کہ وہ ٹپکائی جائے۔ (سورۃ النجم، آیت 45،46)

جینیات (Genetics) اور سالماتی حیاتیات (Molecular Biology) کی جدید تحقیقات نے قرآن کریم کی فراہم کردہ ان معلومات کی تصدیق سائنسی طور پر کر دی ہے۔ یہ جان لیا گیا ہے کہ مرد کے کرم منی کے خلیے ہی جنس کا تعین کرتے ہیں اور عورت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

کروموسوم (Chromosome) پیدا ہونے والے بچے کی جنس کے تعین کا اہم عامل ہے۔ بچے کے چھیالیس کروموسومز میں سے دو کروموسوم انسان کی جنس کا تعین کرتے ہیں اور یہ Sex Chromosome کہلاتے ہیں۔ یہ دو کروموسوم، مرد میں ایکس وائی (XY) اور عورت میں ایکس ایکس (XX) کہلاتے ہیں، کیوں کہ ان کروموسوم کی شکل انگریزی کے حروف ایکس اور وائی سے ملتی ہے۔ وائی کروموسوم

میں مردانہ جنس کے جینز ہوتے ہیں جبکہ ایکس کروموسوم میں زنانہ جنس کی خصوصیات والے جینز ہوتے ہیں۔

نیا انسان بننے کا عمل ان کروموسوم میں سے کسی ایک کے باہم ملاپ سے وجود میں آتا ہے جو مرد اور عورت میں جوڑوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ عورت میں جنسی خلیوں کے دونوں حصے، جو بیضہ بننے کے دوران (Ovulution) دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، ایک کروموسوم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ دوسری جانب مرد کے جنسی خلیے دو مختلف قسم کے کرم منوی بناتے ہیں۔ ایک میں X، اور دوسرے میں Y کروموسوم پائے جاتے ہیں۔

اگر عورت کی جانب سے ایک ایکس کروموسوم، مرد کے اس ایک کرم منی کے ساتھ مل جائے جو اپنے اندر ایکس کروموسوم رکھتا ہے تو بچے کی جنس مادہ ہوگی اور اگر یہ اس کرم منی سے مل جائے جو وائی کروموسوم رکھتا ہے تو بچے کی جنس مرد ہوگی۔ بہ الفاظِ دیگر، مرد کے کروموسوم ہی بچے کی جنس کا تعین، عورت کے بیضے کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔

جینیات سے پہلے بیسویں صدی تک ان عوامل کے بارے میں کچھ واقفیت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے معاشروں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ عورت کا بدن آنے والے بچے کی جنس کا تعین کرتا ہے۔ اسی لیے عورت کو لڑکی کی پیدائش پر ملامت کیا جاتا تھا اور ایسی عورت منحوس قرار دی جاتی تھی۔

تیرہ صدیاں پہلے ''جین'' کی دریافت نہیں ہوئی تھی، مگر قرآن میں یہ معلومات فراہم کر دی گئی تھیں کہ جو ان اوہام اور غلط سوچ کی تردید کرتی ہیں۔ قرآنی معلومات سے پتا چلتا ہے کہ جنس کے تعین کا عمل جس انداز سے طے پاتا ہے، اس کی ذمے دار عورت نہیں ہوتی، بلکہ مرد اس کا ذمے دار ہوتا ہے... کیوں کہ اس تعین میں اہم کردار مرد کے جسم سے خارج ہونے والا مادۂ تولید ادا کرتا ہے۔

رحم مادر سے چمٹنے والا لوتھڑا

جب مرد کا کرم منوی عورت کے بیضے کے ساتھ جڑ جاتا ہے تو ہونے والے بچے کا جوہر جن جاتا ہے۔ یہ واحد خلیہ جو ''جفتہ'' (Zygote) کہلاتا ہے، اب تقسیم در تقسیم ہو کر بڑھنا شروع ہو جائے گا اور بالآخر، ''گوشت کا لوتھڑا'' (جنین) بن جائے گا۔ یہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اسے خردبین (Microscope) ہی سے دیکھنا ممکن ہے۔

یہ جنین اپنی نشوونما کا وقت بے سود نہیں گزارتا۔ یہ رحم مادر کی دیوار کے ساتھ پودوں کی جڑوں کی طرح چمٹ جاتا ہے۔ یوں، جنین ماں کے بدن سے اپنی پرورش کیلئے ضروری اجزا حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس مرحلے پر قرآن کا ایک اور نمایاں معجزہ نظر آتا ہے۔ اس مرحلے کا حوالہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ''علق'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ () خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ()
اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ()

ترجمہ: پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے۔

(سورۃ العلق، آیات 1 تا 3)

قرآن نے اس زمانے میں یہ بات کہہ دی کہ انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ یہ رحم مادر میں نر اور مادہ کے ملاپ کے بعد ''جفتہ'' (زائگوٹ) کی جانب اشارہ ہے جو ایک خون کے لوتھڑے یا جمے ہوئے خون کی مانند ہی ہوتا ہے۔ عربی میں لفظ عَلَق کا مطلب ہے، وہ چیز جو کسی جگہ چمٹ یا لٹک جائے۔ لغوی معنی میں یہ لفظ ایسی جونکوں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جو بدن کے ساتھ خون چوسنے کیلئے چمٹ جاتی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی کی ابتدا ہی میں اس دوسری آیت میں تخلیق کا یہ عمل بتانے

کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں دراصل وحی بھیجنے والی ہستی کا تعارف کرایا جارہا ہے کہ وہ رب ہے، وہ خالق ہے۔ اگر وہ خالق ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے کہ وہی خالق ہے۔ اس کے ثبوت کیلئے تخلیق کا وہ مرحلہ بیان کردیا جو اس وقت انسان کے علم میں نہیں تھا۔ ظاہر ہے یہ مرحلہ ایک خالق ہی جان سکتا ہے۔ کیوں کہ اُس زمانے میں سائنسی نے یہ بات دریافت ہی نہیں کی تھی کہ رحم مادر میں مادہ اور نر کے پانی کے ملاپ سے ''جفتہ'' تشکیل پاتا ہے۔

یہ مرحلہ اولین مخاطبین یعنی مشرکین مکہ کے لیے اہم نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ سائنسی علم کے ارتقا کے بغیر اس سچائی کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ خون کے لوتھڑے کو ایک دوسری فارم میں جانتے تھے۔ البتہ انہیں اس بات کا شعور ضرور تھا کہ انسان ایک حقیر سے نطفے سے پیدا ہوتا ہے۔

یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ وحی جس ہستی کی جانب سے بھیجی جارہی ہے وہ کتنی عظیم اور قدرت رکھتی ہے کہ ایک جمے ہوئے خون سے زندگی پیدا کرتی ہے۔ یہ اس کی عظمت کی وہ دلیل ہے انسان کی نظروں کے سامنے ہے۔ اسی وحی میں جب آگے یہ بتایا جائے گا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا تو اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ اس وحی اور اس پیغام کا بھیجنے والا کوئی معمولی نہیں بلکہ ہر شے پر قادر ہے۔

بہ ہر کیف، ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ علق کا لفظ یہاں رحم مادر میں پرورش پانے والے جنین کیلئے انتہائی مناسب لفظ کا انتخاب ہے۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ قرآن اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی وحی ہے جو اس کائنات کا خالق اور مالک ہے، کسی انسان کے بس میں یہ نہیں تھا کہ یہ بات کرپائے۔

عضلات یا گوشت کا ہڈیوں پر چڑھنا

قرآن میں فراہم کی گئی معلومات ایک اور اہم جز رحم مادر میں انسان کی نشوونما ہے، ان

آیات میں بتایا گیا ہے کہ رحم مادر میں پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر گوشت یا عضلات ہڈیوں کے اوپر لپیٹ دیے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝
ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ
لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝

ترجمہ: اور البتہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے حفاظت کی جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کا لوتھڑا بنایا پھر ہم نے لوتھڑے سے گوشت کی بوٹی بنائی پھر ہم نے اس بوٹی سے ہڈیاں بنائیں پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت پہنایا، پھر اسے ایک نئی صورت میں بنادیا، سو اللہ بڑی برکت والا سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

(سورۃ المومنون، آیات 12 تا 14)

جنینیات (Embryology) سائنس کی وہ شاخ ہے جو رحم مادر میں جنین کا مطالعہ کرتی ہے۔ حالیہ دور تک اس علم کے ماہرین کا خیال تھا کہ جنین کا گوشت اور ہڈیاں ایک ہی وقت میں بنتے ہیں۔ اس وجہ سے خاصے عرصے تک یہ خیال رہا کہ یہ آیات سائنسی حقائق سے متصادم ہیں۔ لیکن، نئی ٹکنالوجی کی پیش قدمی سے ہونے والی ترقی یافتہ خردبینی تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ قرآن کا یہ انکشاف بالکل درست ہے۔

خردبینی مشاہدات نے بتایا کہ اندرونِ رحم مادر بچے کی نشوونما بالکل اسی طرح ہوتی ہے، جیسے ان آیات میں بتایا گیا ہے۔ پہلے جنین کی کری نما ہڈی تبدیل ہوکر ہڈی بنتی ہے۔ اس کے بعد ہڈیوں کے گرد موجود بافتوں میں سے مخصوص عضلاتی خلیات ایک ساتھ جمع ہوتے اور ہڈیوں کے گرد لپٹ جاتے ہیں۔

ساتویں ہفتے کے دوران انسانی ہڈیوں کا ڈھانچا سارے بدن میں پھیلنے لگتا ہے اور

ہڈیاں خاص شکل اختیار کرنے لگتی ہیں۔ ساتویں ہفتے کے آخر اور آٹھویں ہفتے کے دوران ان ساخت شدہ ہڈیوں کے گرد عضلات (گوشت) اپنی جگہ جمتے جاتے ہیں۔

انگلیوں کے نشانات

آج پوری دنیا میں بائیومیٹرک سسٹم کی تنصیب ہوچکی ہے۔ بینک اے ٹی ایم سے لے کر نادرا اور ایرپورٹ تک، سبھی جگہ بائیومیٹرک کے ذریعے انفرادی شناخت کو ممکن کیا جاتا ہے۔ بائیومیٹرک سسٹم دنیا کا سب سے جدید اور سب سے معتبر شناختی نظام ہے۔

بائیومیٹرک میں انسان کی انگلیوں کے نشانات کو ریکارڈ کرکے کمپیوٹر کے ذریعے ان کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یوں، درست آدمی کا پتا چل سکتا ہے۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ پوری دنیا میں ہر انسان کی انگلیوں کے نشانات اس کرۂ ارض پر موجود باقی انسانوں کی انگلیوں کے نشانات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

بہ ظاہر، یہ چھوٹی سی بات لگتی ہے، لیکن اگر آپ ان کی بناوٹ اور ان کے منفرد ہونے پر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ سب کچھ انتہائی حیران کن نظام کے تحت ہی ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انگلیوں کے نشانات تک کا ذکر کیا ہے:

اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ ()

بَلٰى قٰدِرِيۡنَ عَلٰٓى اَنۡ نُّسَوِّىَ بَنَانَهٗ ؕ ()

ترجمہ: کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی (بکھری ہوئی) ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے؟ ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کردیں۔

(سورۃ القیامہ، آیت 3،4)

انگلیوں ے نشانات کا بہ طورِ خاص تذکرہ، بہت ہی خاص مفہوم رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کی انگلیوں کے نشانات مختلف ہوتے ہیں۔ ہر انسان جو اس وقت زندہ

ہے یا کسی وقت اس دنیا میں رہا تھا، اس کی انگلیوں کے نشانات دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ انگلیوں کے نشانات کے زریعے اس کے مالک کی شناخت کی جاتی ہے۔ پوری دنیا میں آج بائیومیٹرک طریقہ اسی لیے سب سے موثر اور معتبر مانا جاتا ہے۔ تاہم، اہم بات یہ ہے کہ انگلیوں کے نشانات کی یہ خاصیت انیسویں صدی میں جا کر دریافت ہوئی۔ اس سے پہلے انسان کو اپنے بارے میں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ لوگ انگلیوں کے نشانات کو خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ کتنی حیران کن بات ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کہ جب دنیا میں کوئی انسان یہ بات نہیں جانتا تھا، مگر آں حضرت ﷺ نے قرآن کے ذریعے یہ انکشاف کیا، یہ نکتہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا گیا کلامِ الٰہی ہے۔ یہ انسانی کاوش نہیں ہوسکتی۔

خصیہ اور نطفہ

نطفہ ایک نئے انسان کی تخلیق کی جانب پہلا قدم ہے۔ نطفے یا مادۂ منویہ کا پیدا ہونا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب جسم کے عام درجہ حرارت سے دو درجے زیادہ سرد ماحول میسر ہو۔ درجہ حرارت کو اس سطح پر قائم رکھنے کیلئے خصیوں کے اوپر ایک خاص قسم کی کھال ہوتی ہے۔ یہ سرد موسم میں سکڑتی اور گرم موسم میں پھیلتی ہے جس سے درجہ حرارت غیر متغیر ہوجاتا ہے۔ کیا مرد اس نازک توازن کو خود قائم رکھتا ہے اور اِس میں باقاعدگی وہ خود لاتا ہے؟ یقیناً نہیں!

مرد کو تو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جو تخلیق کی حقیقت کے خلاف ہیں، صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''یہ انسانی جسم کا ایک ایسا کام ہے جس کے بارے میں ابھی تک کچھ دریافت نہیں ہوسکا۔''

نطفہ خصیوں میں ایک ہزار فی منٹ کی شرح سے پیدا ہوتا ہے اور عورت کے بیضہ دان

تک پہنچنے کیلئے اسے ایک خاص شکل دی جاتی ہے۔ یہ نطفے کا ایک ایسا سفر ہوتا ہے جو یوں طے ہوتا ہے جیسے وہ اس جگہ سے ''واقف'' ہے کہ جہاں اسے پہنچنا ہے۔ نطفے کا ایک سر، ایک گردن اور ایک دُم ہوتی ہے۔ اس کی دُم رحم مادر میں داخل ہونے میں مچھلی کی مانند اس کی مدد کرتی ہے۔

اس کے سر والے حصے میں بچے کی جینیاتی کوڈ کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اسے ایک خاص حفاظتی ڈھال سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس ڈھال کا کام اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ جب نطفہ، رحم مادر میں داخل ہونے والے راستے پر پہنچتا ہے۔ یہاں کا ماحول بڑی حد تک تیزابی ہوتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے ک نطفے کو حفاظتی ڈھال سے ڈھانپنے والا کوئی ہے جسے اس تیزاب کا علم ہے، کیوں کہ تیزابی ماحول ہی کی وجہ سے ماں کو خردبینی جرثوموں سے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ گویا، اگر یہاں تیزابی ماحول نہ پایا جائے تو ماں کیلئے بیمار ہونے کے خطرات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ()
اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ()

ترجمہ: انسان پر کبھی ایسا وقت آیا ہے کہ نہیں جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا۔ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے اس طرح پیدا کیا کہ اسے آزمائیں۔ پھر، اسے ایسا بنایا کہ وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔ (سورۃ الدہر، آیات 1،2)

نطفے کے اندر ان سیال مادوں میں شکر ہوتی ہے جو اسے مطلوبہ توانائی فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بنیادی ترکیب میں اس کے ذمے کئی کام ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ رحم مدر کے داخلی راستے کے تیزابوں کو بے اثر کرتی ہے اور نطفے کو حرکت دینے کیلئے درکار پھسلن

کو برقرار رکھتی ہے۔ یہاں بھی غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ دو بہ ظاہر مختلف چیزیں ایک دوسرے سے خاص مقصد کیلئے ہم آہنگ ہو رہی ہیں جو یقیناً الل ٹپ ممکن نہیں تھا۔

منی کے جرثومے ماں کے جسم کے اندر ایک مشکل سفر طے کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ بیضے تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ جس قدر بھی اپنا دفاع کریں، لگ بھگ ایک ہزار جرثومے کسی نہ کسی طرح سفر کرتے ہوئے بیضے تک پہنچ جاتے ہیں۔

بیضہ

گو نطفے کا نمونہ بیضہ کے مطابق تیار کیا جاتا ہے، مگر دوسری طرف اسے ایک بالکل مختلف ماحول میں زندگی کے ایک بیج کے طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ عورت اس بات سے جس وقت بے خبر ہوتی ہے، اس وقت سب سے پہلے ایک بیصہ جسے بیضہ دان میں بلوغت تک پہنچایا جاتا ہے، عورت کی شکمی جوف میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر رحم مادر کی فیلوپی نالیوں کے ذریعے اسے پکڑ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بیضہ فیلوپی نالیوں کے اندر ایک باریک سے بال (Cilia) کی مدد سے حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ بیضہ نمک کے ذرے کے نصف کے برابر ہوتا ہے۔

بیضہ اور نطفہ جہاں ملتے ہیں، وہ مقام ''فیلوپی نالی'' کہلاتا ہے۔ یہاں یہ بیضہ ایک خاص قسم کا سیال مادہ یا رطوبت خارج کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس رطوبت کی مدد سے منی کے جرثومے بیضے کے محل وقع کا پتا لگا لیتے ہیں۔

نفس کیا ہے؟

سورۃ الشّمس میں اللہ تعالیٰ نے نفس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ()

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ()

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ()

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ()

ترجمہ: اور (قسم ہے) انسانی جان کی، اور اس کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اُس کیلئے بدکاری کی ہے، اور وہ بھی جو اُس کیلئے پرہیزگاری کی ہے۔ فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے۔ اور نامراد وہ ہوگا جو اُس کو (گناہ میں) دھنسا دے۔ (سورۃ الشّمس، 7 تا 10)

نفس کے تذکرے میں یہ چار آیات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہمیں یہ بتایا کہ انسان اپنی پوری زندگی گاہے گاہے اپنے نفس کے ان تین مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔ دراصل، ہم جسے نفس کہہ رہے ہیں، وہ کوئی مادی شے نہیں بلکہ انسان کی تین کیفیات (States) کے نام ہیں۔ گویا، انسان مختلف اوقات میں مختلف کیفیات سے

گزرتا رہتا ہے۔

نفسیات کے طالب علم کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ ماہرین نفسیات نے بھی اس پر بہت تحقیق کی ہے اور اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے مختلف اوقات میں مختلف نظریات پیش کیے۔ خاص کر سگمنڈ فرائیڈ کا کام اس ضمن میں سب سے نمایاں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے نفس کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے نفس کے مختلف مراحل بیان فرما دیے ہیں۔ قرآن کریم کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ تین طرح کے نفس ہیں:

اول نفس امارہ

دوم نفس لوامہ

سوم نفس مطمئنہ

تین طرح کے نفوس دراصل تین طرح کے انسانوں کی تقسیم ہیں۔ جو آدمی جس مرحلے کے نفس پر عمل کرتا ہے، وہ رفتہ رفتہ ویسی ہی شخصیت میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔

یہ تینوں کیا ہیں اور ہمارے لیے کیا کرتے ہیں، ان کو ہم تین دوستوں کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے، تین دوست ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گئے۔ یہ تینوں دوستوں نے کھانا کھایا اور پھر بل ادا کر کے واپس روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک دوست نے اپنی جیب سے ایک ٹونٹی نکالی اور دوسرے دوستوں کو دکھاتے ہوئے بولا کہ اس نے یہ ٹونٹی ہوٹل سے نکالی ہے۔ دوسرے دوست نے یہ دیکھ کر پہلے دوست سے کہا کہ تم یہ ٹونٹی لے کر کیوں آ گئے ہو؟ پہلے دوست نے اعتماد سے جواب دیا کہ چونکہ ہوٹل کا کھانا بہت مہنگا تھا، اس لیے بیت الخلا میں سے یہ ٹونٹی لے آیا ہوں۔ دوسرے دوست نے پہلے دوست کی یہ منطق سن کر کہا کہ ہاں، اگرچہ ٹونٹی چرانا ہے تو غلط، لیکن کھانا تو واقعی بہت مہنگا تھا۔ تیسرے دوست

نے پوچھا، جب تم نے کھانے کا آرڈر دیا تھا تو کیا اس مینیو پر کھانے کی قیمت نہیں لکھی تھی؟ جب ہمیں اس کھانے کی قیمت معلوم تھی تو کھانے کی زیادہ قیمت کو دلیل بنا کر ہم یہ ٹونٹی کیسے رکھ سکتے ہیں؟ لہٰذا، ہمیں واپس جا کر یہ ٹونٹی ہوٹل کو واپس کر دینی چاہیے۔

ان تین دوستوں میں سے پہلے دوست ''نفس امارہ'' ہے جو برائی کو برائی سمجھنے کے باوجود اس کے دفاع کیلئے جواز بھی پیش کر رہا ہے۔ دوسرا دوست ''نفس لوامہ'' ہے جو برائی کو تسلیم تو کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی نفس امارہ کا ساتھ بھی دیتا ہے کہ چونکہ کھانا مہنگا تھا، اس لیے ٹونٹی چوری کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ تیسرا دوست ''نفس مطمئنہ'' ہے جو کسی طرح یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ ہوٹل کا کھانا مہنگا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے لیے چوری جائز ہے۔ جب کہ ہمیں پہلے سے کھانے کی قیمت معلوم تھی۔ اس لیے ہمیں اس عمل کی تلافی کرنی ہوگی اور ہوٹل کی ٹونٹی ہوٹل کو واپس کرنی ہوگی۔

اب ہم تینوں کو ذرا تفصیل میں سمجھتے ہیں۔

نفسِ امّارہ

نفس کا پہلا درجہ ''امارہ'' ہے۔ اسی درجے کے بارے میں قرآن میں ہے:

وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ
اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ()

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بے شک نفس تو برائی سکھاتا ہے مگر جس پر میرا رب مہربانی کرے، بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورہ یوسف، 53)

یہ نفس کا پہلا درجہ ہے۔ یہ نفس اتنا طاقت ور ہے کہ انسانوں کی زیادہ تر تعداد اسی کے جال میں پھنسی رہتی ہے اور موت آنے تک نکل نہیں پاتی۔ اگرچہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی ودیعت کی ہے کہ وہ اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کر سکے، لیکن اس کے باوجود نفس

امارہ انسان کی نیکی اور پرہیزگاری کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کر دیتا ہے۔ اس لیے، آدمی اگر چاہے بھی کہ وہ اس کے داؤ سے نکل جائے تو بہت زیادہ ہمت و جرات کی ضرورت پڑتی ہے۔

انسانی تاریخ میں ہمیشہ جو اخلاقی اور معاشرتی اور تہذیبی برائیوں نے جنم لیا، وہ سب نفس امارہ کا محرک رہی ہیں جنھیں مختلف دیدہ زیب ناموں کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے تا کہ عام آدمی اس کے دام میں بہ آسانی آجائے۔ آج بھی ہمیں ایسی مثالیں اپنے اردگرد عام مل جائیں گی۔ المیہ یہ ہے کہ ان برائیوں کو برا جانتے ہوئے اور یہ شعور رکھتے ہوئے بھی یہ کام غلط ہیں، ایک غیر معمولی تعداد انھیں اختیار کی ہوئی ہے، کیوں کہ یہ لوگ نفس امارہ کی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔

محقق علما کے مطابق، نفس امارہ کی چار قسمیں ہیں:

1 **نفس عدوانیه:** اس کا کام سرکشی ہے یہ احکام اور قوانین کی پابندی سے کتراتا ہے۔ ان کو سلبِ آزادی تصور کرتا ہے لہذا بغاوت پر آمادہ رہتا ہے۔

2 **نفس بہیمیه:** اس کا مطلوب و معبود شہوتِ بطن اور فرج ہیں۔ یہ بآسانی میسر آگئے تو ٹھیک ورنہ یہ برسر پیکار ہوتا ہے۔ جس سے انسان نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

3 **نفسِ تسلطیه:** اس کا تقاضا شہرت اور حصولِ مرتبت ہے جن کو ''حبّ جاہ'' کہتے ہیں۔ انسان بچپن سے ہی دوسروں پر غالب آنے اور حکم چلانے کا جنونی شوق دروں پالتا ہے۔ اس کی یہ آرزو پوری ہو تو ٹھیک ہے ورنہ بے چین ہوتا ہے۔

4 **نفس شیطانیه:** یہ شیطان کا غلام ہے۔ شیطان ہی کی مانتا اور سنتا ہے۔ انسان کو مسلسل برائی اور گناہ کا حکم دیتا رہتا ہے۔

ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا، ایسے دوست کے بارے

میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ... تو وہ تمہیں بلا اور مصیبت میں ڈال دے۔ اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو... تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے زیادہ بُرا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا۔

آں حضرت ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے، وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔ (قرطبی)

ایک اور حدیث میں آں حضرت ﷺ کا فرمان ہے:

''تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں بُرے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل وخوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔''

ایسے ہی قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

ترجمہ: اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں، وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ (سورۃ الحشر:9)

نفسیات کی رُو سے، انسان کے اندر ایک شے ہوتی ہے جسے انھوں نے ID کا نام دیا۔ ہم اسے نفس امارہ کہہ سکتے ہیں اور انسان کی جبلت میں ہے۔ جب انسان کو کسی شے... غذا، جنس یا نیند... کی طلب ہوتی ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اسے فوری مل جائے۔ وہ اپنی خواہش کی اسی وقت تکمیل چاہتا ہے۔ اس سے اگلے مرحلے پر، انا یا Ego ہے جو اسے کہتی ہے کہ ابھی ٹھہر جایئے، میں آپ کیلئے کچھ کرتی ہوں۔ ایگو آدمی کو پہلے مرحلے پر اس کی خواہش یا طلب کو روکتی ہے تاکہ کچھ دیر آدمی خواہش سے رک جائے۔ ان میں سب سے اوپر

Super Ego ہے جو یہ بتاتی ہے کہ انسان کو جب ان تینوں چیزوں... غذا، جنس یا نیند... کی طلب ہوتی ہے تو اس کیلئے اسے اس معاشرے، ملک یا رسوم کے بنائے ہوئے چند قوانین اور ضابطوں کے تحت ہی حاصل کرنی ہوں گی۔ سپرا یگو یہ بتاتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے۔

ایسے میں، انا ان دونوں یعنی ایڈ اور سپرا یگو کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرتی ہے کہ سپرا یگو جن ضابطوں کی بات کرتی ہے اسے کیسے عملی طور پر ممکن بنایا جائے اور ایڈ جس بے صبری کا مظاہرہ کر رہا ہے، اسے کیسے غلط کام سے روکا جائے۔

نفسیات کی رُو سے انسانی جبلت کو اس انداز سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ البتہ نفسیات کا کہنا ہے کہ جب ایڈ یا سپرا یگو، دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر حاوی ہو جاتے ہیں تو آدمی نفسیاتی بیمار ہو جاتا ہے۔

نفسیات کے بعد ہم قرآن کی طرف آتے ہیں تو قرآن میں ہمیں چند ایسے کردار ملتے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ نفس امارہ کی کیفیت پر ڈھٹائی سے قائم رہے۔ ان بڑے کرداروں میں فرعون، ہامان، قارون، نمرود، ابوجہل وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور دولت جمع کرنے میں اپنی ساری زندگی لگا دی۔ وہ اپنی پوری زندگی ہر غلط اور درست عمل کے ذریعے زیادہ سے زیادہ دولت اور شہرت جمع کرنے میں لگے رہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بہ بانگ دہل اپنے لیے جہنم کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی نفس امارہ پر نہ صرف گزاری، بلکہ پوری ڈھٹائی اور بے غیرتی کے ساتھ اپنے نفس کو موٹا کرنے میں لگے رہے۔ قرآن پاک میں انھی لوگوں کے بارے میں ارشادِ گرامی ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ

وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰہِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ

ترجمہ: پھر کیا تم نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنا خدا نفسانی خواہش کو بنالیا ہے اور علم کے باوجود اللہ نے اسے گمراہی میں ڈال دیا، اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی، اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا؟ اب اللہ کے بعد کون ہے جو اسے راستے پر لائے؟ کیا پھر بھی تم لوگ سبق نہیں لیتے؟ (سورۃ الجاثیہ،23)

نفس لوامہ

جب نفس امارہ کی کسی حد تک اصلاح ہوجاتی ہے تو اسے کوئی برا کام کر لینے کے بعد ایک طرح کی ندامت اور خفت کا احساس ہونے لگتا ہے برائی اور کوتاہی پر نادم ہونے لگتا ہے مگر برائی سے بالکلیہ انقطاع اس کا نہیں ہوتا۔ قرآنِ پاک میں ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ۝

ترجمہ: قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ (سورہ قیامہ،2)

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے نفس لوامہ کی قسم کھائی، کیونکہ انسان کے نفس میں برے اور بھلے کی پوری تمیز موجود ہے۔ پھر اسی تمیز کا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے۔ یہی قیامت اور آخرت کا اصل مقصد ہے۔ عرفِ عام میں اسے ''ضمیر'' کہتے ہیں۔ معروف ادیب اور شاعر عطاء الحق قاسمی کے بقول، ضمیر کچھ نہیں ہوتا، صرف گناہ کی لذت کو کرکرا کرتا ہے۔

نفس مطمئنہ

نفس مطمئنہ نفس کا تیسرا اور اعلاترین درجہ ہے۔ یہ نفس امارہ کے بالکل برعکس ہے۔

عمل صالح میں ترقی اور قرب حق تعالیٰ کے حصول میں کوشش کرتے کرتے جب آدمی کا حال یہ ہوجائے کہ شریعت اس کی طبیعت بن جائے اور خلافِ شرع کام طبعی نفرت بھی

ہونے لگے تو اس نفس کا لقب مطمئنہ ہوجاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ۝

ترجمہ: اے مطمئن نفس، (وہ جان جو اللہ کی اطاعت میں چین پا چکی ہے) اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی۔

(سورۃ الفجر، آیات 27،28)

اس اطمینان کا اس وقت تک تصور نہیں کیا جاسکتا جب تک انسان سے صفاتِ رذیلہ دور نہ ہوجائیں اور یہ اس وقت تک دور نہیں ہوتیں جب تک انسان اللہ تعالیٰ کی صفات حمیدہ کی تجلیات سے بہرہ ور نہ ہو۔ ان میں وہ فنا ہوجائے اور ان کے ساتھ اس کو بقا نصیب ہو، اسی وقت انسان کو ایمان حقیقی نصیب ہوتا ہے اور اسی وقت اسے اطمینان کی دولت ارزانی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی مثال بھی قرآن میں بیان کی ہے۔ مثال کے طور پر، نبی، رسول، شہدا، صالحین وغیرہ۔ آج بھی ایسے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں (اگرچہ بہت قلیل مقدار میں ہیں) جو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ نفس مطمئنہ والی کیفیت میں رہتے ہوئے گزارتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ خاکی سے زیادہ روحانی وجود والے لوگ ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے روحانی پیغام کے ساتھ اس قدر منسلک اور قریب ہیں کہ دنیا کی تمام خاکی اور مادی کثافتوں سے خود کو بہت دور رکھتے ہیں۔ نفس مطمئنہ کے ساتھ دنیاوی زندگی گزارنے والے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پیشین گوئی کردی کہ جب وہ آخرت میں آئیں گے تو انھیں کہا جائے گا کہ وہ جنت کے جس دروازے سے داخل ہونا چاہیں، داخل ہوں۔

اس گفتگو سے ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ جنت اور جہنم کا معاملہ موت کے بعد کا نہیں ہے کہ مر کر ہی حساب کتاب ہوگا، بلکہ اس دنیا میں بھی جنتی اور جہنمی لوگ موجود ہیں۔

پاکیزہ روحیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتی ہیں، آج بھی اللہ کا قانون ہے کہ وہ بغیر حساب کتاب سیدھی جنت میں جائیں گی۔

نفسِ امارہ کے شرور سے بچنے اور نفسِ مطمئنہ تک پہنچنے کا طریقہ

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ آتِ نَفْسِیْ تَقْوَاھَا وَزَکِّھَا أَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰاھَا أَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلاَھَا ، اَللّٰھُمَّ إِنِّی أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لاَ یَنْفَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لاَ یَخْشَعُ، وَمِنْ نَفْسٍ لاَ تَشْبَعُ، وَمِنْ دَعْوَۃٍ لاَ یُسْتَجَابُ لَھَا

ترجمہ: یا اللہ! میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما، اور اس کا تزکیہ فرما تو ہی اس کا بہترین تزکیہ کرنے والا ہے، تو ہی تزکیہ کرسکتا ہے اور میرے نفس کا مولا ہے، یا اللہ! میں غیر مفید علم، خشوع سے عاری دل، سیر نہ ہونے والے نفس، اور مسترد ہو جانے والی دعا سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ (مسلم)

اسی طرح ترمذی میں روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے والد کو دو جملے دعا کیلئے سکھائے تھے:

اَللّٰھُمَّ أَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَأَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ

ترجمہ: یا اللہ! میری رہنمائی میرے دل میں ڈال دے اور مجھے میرے نفس کے شر سے محفوظ فرما دے۔

نفس کو مشقت میں ڈالنا

نفس کی اصلاح کے طریقے بھی علما و صلحا بتاتے رہے ہیں اور یہ سب قرآن، آں حضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ سے اخذ کردہ ہیں۔ قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا

ترجمہ: اور جنھوں نے ہمارے لیے مشقت اٹھائی، انھیں ہم ضرور اپنی راہیں سجھائیں گے۔ (عنکبوت،69)

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے شریعت نفس کی مخالفت پر نازل ہوئی ہے کہ امر بالنفس امارہ کو نفس لوامہ اور پھر یہاں سے نفس مطمئنہ تک پہنچانے کے سفر میں نفس کی تربیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسا نہیں کہ آپ چاہیں اور نفس پاکیزہ اور مطہر ہو جائے۔ نفس کا تزکیہ مجاہدے کے بغیر ممکن نہیں۔ ہر شے کیلئے کوئی نہ کوئی قانونِ فطرت لاگو ہوتا ہے اور اس فطری قانون کے بغیر اس شے سے استفادہ اور تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر، اگر آپ لوہے سے کام لینا چاہتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھانے کے خواہش مند ہیں تو آپ کو اسے بھٹی میں جھونکنا پڑے گا۔ کوئی فوجی میدانِ میں اترے بغیر، سخت سردی اور شدید گرمی جھیلے بغیر فوجی نہیں بن سکتا۔ آپ اپنی اولاد کو اگر دنیاوی لحاظ سے کامیاب اور سرخ رُو دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے کسی نہ کسی اسکول میں داخل کراتے ہیں اور دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی مصروف رکھتے ہیں۔ یہ وہ فطری شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر کسی مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی نفس کی کیفیت میں تبدیلی... نفس امارہ سے نفس لوامہ... نفس لوامہ سے نفس مطمئنہ ... کا یہ سفر بھی چند شرائط اور ضابطوں کے تابع ہے۔ ان شرائط کی تکمیل کے بغیر آپ اپنے نفس کو ''مطمئنہ'' کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ ان شرائط میں سب سے بڑی شرط ہے... مجاہدہ!

مجاہدے کے بغیر نفس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے، جَاھَدُوْا کی شرط عائد کی گئی ہے۔ تمام تر قرآنی تعلیمات جن سے اسلامی شریعت اخذ کی گئی ہے، نفس کی مخالفت پر اتری ہیں۔ کیوں کہ نفس (نفس امارہ) غیر مُزَکّٰی ہے اور اس پر سب سے زیادہ بوجھ احکام الٰہی کا آتا ہے۔ اسی لیے، اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنا ہی سب سے مشکل معلوم

دیتا ہے۔سب سے عام مثال آپ روزانہ کی زندگی سے ہی لے لیجیے۔روزانہ صبح سویرے فجر کی نماز میں اٹھنا کتنا مشکل ہوتا ہے،خواہ سردیوں کے دن ہوں یا گرمیوں کا موسم۔لیکن، اگر آپ کو صبح سویرے کسی جگہ جانا ہوتو آپ کیسے فراٹے بھرتے ہوئے صبح سویرے اٹھ جاتے ہیں اور ذرا نیند یا تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔

الٰہی احکام قرآن کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اور ان احکام کی عملی تطبیق ''سنت'' اور ''سیرت'' سے ملتی ہے۔چنانچہ دونوں ہی قائم مقام ہیں۔ذرا غور کیجیے کہ چونکہ نفس کو احکام الٰہی پر عمل کرنے سے بوجھ آتا ہے تو سنت پر عمل کرنا بھی نفس کیلئے بوجھل ہوتا ہے۔سنت عمل خواہ کتنا ہی آسان اور مفید ہو، چونکہ اس کا تعلق اللہ کے حکم سے ہے، روح سے ہے، اس وجہ سے سنت پر عمل کرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔مجھے کہنے دیجیے کہ ایک جانب تو لوگ سارا سارا دن بستر توڑتے ہیں، لیکن اگر بات قیلولہ کی سنت کی آجائے تو کتنے لوگ ہیں جو قیلولے جیسی آرام دہ سنت ادا کرتے ہوں۔آپ آرام بھی کریں اور نیت سنت کی ہو، اللہ کی رضا ہو... تو آپ کا آرام بھی آپ کے نفس کے تزکیے ذریعہ بنے گا۔

آں حضرت ﷺ کے ارشاد پاک کا مفہوم ہے کہ جنت بہت حسین ہے، مگر اسے مشکلات (مجاہدات) سے سجایا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ لوگ بہ ظاہر ایک ہی کام کر جاتے ہیں، مگر نفس کو موٹا کرنے کیلئے کرتے ہیں۔لیکن، اگر وہی کام اس لیے کرنے کو کہا جائے کہ اللہ کا حکم ہے یا آں حضرت ﷺ کی سنت ہے تو لوگوں کیلئے اس پر عمل مشکل ہوجاتا ہے۔اس کی ایک مثال میں قیلولے کی دے چکا ہوں۔ایسی بہت سی مثالیں آپ کو اپنے اردگرد مل جائیں گی۔بلکہ برا نہ مانیں تو آپ کو اپنا محاسبہ کرکے دیکھ لیجیے۔آپ کئی ایسے کام کرتے ہوں گے جو سنت سے مطابقت رکھتے ہیں، مگر آپ کی نیت سنت کی نہیں ہے۔اگر سنت کی بات آجائے تو نفس پر بوجھ محسوس ہوگا۔الامان والحفیظ!

یہاں مجھے حضرت علیؓ کا جنگ خیبر کا واقعہ یاد آگیا کہ جب انھوں نے خیبر کے

حکمراں پہلوان کو چت کردیا اور اس نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوکا تو حضرت علی نے اسے فوراً چھوڑ دیا۔ساتھیوں نے پوچھا کہ اس کے اس غلیظ عمل پر تو اسے فوراً قتل کردینا چاہیے تھا۔حضرت علی نے جو کچھ فرمایا، اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ جب اس نے میرے منہ پر تھوکا تو مجھے غصہ آگیا۔اگر ایسی حالت میں، میں اسے قتل کردیتا تو اس میں اللہ کی رضا خالص نہ رہتی، بلکہ میرے نفس کا غصہ بھی شامل ہوجاتا۔

بہترین سے بدترین تک

اب ہم ایک اور اہم نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔اس کا تعلق بھی نفس کے شرور اور فتور سے ہے۔ایک جانب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو بہترین انداز میں تخلیق کیا ہے۔

(سورۃ التین،4)

گویا، میں نے تمہیں بہترین سانچے اور پیمانے سے پیدا کیا۔تم میری بہترین تخلیق ہو۔

پہلی وحی کی تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ

کہ اے انسان، پڑھ کہ تیرا رب سب سے زیادہ کرم کرنے والا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ سورۃ الاسرا (آیت 70) میں فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ

یعنی، اے بنی آدم، میں نے تمہیں اکرام بخشا۔

جب اللہ تعالیٰ نے عزت وتکریم آدم کوبخشی تو دو قسم کے لوگ ہو گئے۔ سورہ بینہ میں اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ یہ میری مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں۔ یا اللہ، ایک جانب تو آپ فرمارہے ہیں کہ ہم نے بنی آدم کو عزت اور اکرام دیا تھا اور دوسری جگہ آپ ہی بتارہے ہیں کہ بنی آدم میں بدترین بھی ہیں۔

یہ بہ ظاہر دو بالکل متضاد باتیں لگتی ہیں۔ یہاں اِشکال تو پیدا ہوتا ہے اور اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت بخشی تھی آدم کو عقل اور شعور عطا کر کے کہ وہ اپنی خلقت کو پہچانے اور اپنے آپ پر غور کرے تا کہ میری طرف آئے۔ چنانچہ سورہ بینہ ہی میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ
فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ

ترجمہ: بے شک جو لوگ اہلِ کتاب میں سے منکر ہوئے اور مشرکین وہ دوزخ کی آگ میں ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی لوگ بدترین مخلوقات ہیں۔

(سورۃ البینہ،6)

میں نے اپنی دلیل بھیجی، اپنی آیات (نشانیاں) بھیجیں، اپنے انبیا بھیجے۔ آسمانی کتابیں اور صحائف بھیجے۔لیکن، انسان نے ان تمام نشانیوں اور دلائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے میرا انکار کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کیلئے اللہ تعالیٰ نے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ کے الفاظ استعمال کیے کہ یہ بدترین لوگوں میں سے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم کی سورۃ الاعراف (آیت 179) میں ان لوگوں کیلئے اس سے زیادہ سخت الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ

ترجمہ: وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے، بلکہ گم راہی میں ان سے بھی زیادہ ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں۔

اور اسی آیت میں ان کے اتنے گھٹیا اور بدترین ہونے کی وجہ بھی فرمادی:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫
وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ

ترجمہ: اُن کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں؛ اُن کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ سنتے نہیں؛ ان کے پاس کان ہیں، مگر ان سے وہ سنتے نہیں۔

(سورۃ الاعراف،179)

کیوں؟

اس لیے کہ یہ آنکھیں رکھتے ہیں، مگر دیکھتے نہیں ہیں۔ یہ کان رکھتے ہیں، مگر سنتے نہیں ہیں۔ یہ دل رکھتے ہیں، مگر سمجھتے نہیں ہیں۔ اس وجہ سے یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جانور بھی کسی نہ کسی درجے میں عقل وخرد رکھتے ہیں۔ ایسا ہی ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کے اندر اس کی ضرورت کے مطابق، مناسب اور بہ قدرِ ضرورت شعور (عقل) رکھا ہے۔ ہم اگرچہ چوپایوں (حیوانوں) کو بے شعور و بے عقل کہتے ہیں، لیکن ان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے فطری لائف اسٹائل کے مطابق حُسن اور ادراک پیدا کیا ہے تاکہ یہ اپنی بقا کا سامان کرنے کے قابل ہوں اور جس مقصد کیلئے انھیں دنیا میں پیدا کیا گیا ہے، اپنے مقصدِ وجود کو پورا کرسکیں۔ مثال کے طور پر، سب سے کم عقل اور ادراک رکھنے والی مخلوق جمادات (پتھر، مٹی وغیرہ) ہیں۔لیکن آج سائنسی تحقیقات کی بنا پر ہم یہ تسلیم کرچکے ہیں کہ ان میں زندگی ہے یعنی یہ بھی سوچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بھی اپنے اپنے انداز سے بڑھتے پھولتے ہیں۔ پھر حیوانات ہیں جو چلتے پھرتے ہیں اور دن بھر اپنی غذا اور بقا کا سامان کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے اتنی عقل اور شعور عطا کیا ہے کہ اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی زہریلی شے کھانے میں آجائے تو اس زہر سے بچاؤ کیلئے

تدابیر کرتے ہیں۔لیکن... جمادات ونباتات ہوں یا حیوانات... انھیں اتنی ہی عقل دی گئی ہے کہ یہ اپنے کھانے پینے، سونے جاگنے اور زندہ رہنے کا انتظام کرلیں۔اس سے زیادہ ان کا اس دنیا میں کوئی مقصد اولین نہیں ہے۔اسی وجہ سے یہ اشرف المخلوقات نہیں ہیں۔

اشرف تو صرف انسان ہے۔تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف کیوں بنایا اور درج بالا آیت میں اسے حیوانات سے بھی بدتر کیوں قرار دیا گیا۔

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ انسان کو چونکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے مطابق زندگی گزارنے اور آخرت کیلئے تیاری کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے، اس وجہ سے وہ اشرف ہے۔دیگر مخلوقات کی دنیاوی زندگی کا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔

دوسرا سوال کہ انسان کو اشرف بنانے کے باوجود اسے چوپایوں سے بدتر کیوں کہا گیا... اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے کہ جن انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے جو اِکرام دیا تھا، انھوں نے اس کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ اپنے تئیں اللہ کو پہچاننے اور جاننے کا موقع کھو دیا۔اس لیے یہ لوگ اس عزت وتکریم سے محروم کر دیے گئے اور یوں، بدترین لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔یہ وہی آدم ہے جسے میں نے اپنے ہاتھ سے سنوارا تھا اور اس کو اشرف ترین مخلوق کے مقام پر فائز کیا تھا۔اپنے کرتوتوں کی وجہ سے یہ بہترین کی بلندی سے بدترین کی گھاٹی میں پہنچ گئے۔

یہاں یہ بھی واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ایسے لوگ اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کی ضروریات کو نہیں سمجھتے یا ان کے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے، اسے دیکھتے یا سنتے نہیں، بلکہ اس دنیا میں جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے، اس سے جو سبق لینا چاہیے، وہ نہیں لیتے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ بات بیان فرمائی ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا

وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ

ترجمہ: جو لوگ ہم سے (آخرت میں) آ ملنے کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے، اور دنیاوی زندگی میں مگن اور اسی پر مطمئن ہو گئے ہیں، اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔

(سورۂ یونس، 4)

یعنی یہ لوگ دنیا کی مادی اور ظاہری دنیا کو تو خوب جانتے ہیں، مگر آخرت سے جاہل غافل ہیں۔اپنی موت اور اس کے بعد آنے والی زندگی سے بے پرواہیں۔یہ لوگ طفل تسلی کیلئے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کائنات یوں ہی بے مقصد پیدا ہوئی ہے اور جو چاہے، جو کچھ کرے، کسی بدکار اور ظالم سے کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔اور نہ کسی نیک انسان کو اپنی نیکی کا صلہ ملے گا۔

کیا آپ میری اس بات سے اتفاق نہیں کریں گے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران اس دنیا میں جتنی سائنسی تحقیقات کی گئی ہیں، وہ زیادہ تر غیر مذہب پرستوں نے کی ہیں؟ عموماً یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ سائنسی تحقیقات پڑھتا چلا جاتا ہے، وہ انھی کی بھول بھلیوں میں کھوتا جاتا ہے۔کیوں کہ وہ اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ انھی اصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے جنھیں اس نے اپنی تحقیقات ومطالعات سے جانا ہے۔یہاں تک تو ٹھیک ہے۔لیکن، اس سے آگے عقل کام کرنے سے قاصر رہتی ہے کہ اگر اتنے پیچیدہ اور منظم قوانین کے تحت یہ سب کچھ کام کر رہا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ منظم پیچیدگی (Systematic Complexity) خود بہ خود ہونے لگے اور بھرپور تنظیم اور ترتیب کے ساتھ ہو۔دراصل، وہ اس نظام کے پیچھے جس ''خالق نظام'' (Creator of the System) کو دیکھنے سے محروم رہتے ہیں، ان آیات میں اسی طرف اشارہ ہے کہ وہ درست سمجھنے، دیکھنے اور سننے کے قابل نہیں۔دراصل، اگر آپ نے یہ مان لیا کہ اس پورے نظام کے پیچھے اللہ ہے تو پھر آپ کو اللہ کی بھی ماننی پڑے گی۔اللہ کو ماننے کا مطلب ہے کہ

نفس امارہ کا طرزِ حیات چھوڑ کر کم از کم نفس مطمئن نہ سہی، نفس لوامہ کے طرزِ زندگی پر تو آنا پڑے گا۔اور، یہیں سارا مزہ کرکرا ہوتا ہے زندگی کا۔اور یہ مزہ چھوڑنے کو یہ لوگ تیار نہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو چوپایوں سے بھی تر مخلوق سے تشبیہ دی ہے۔

نفس امارہ کو ہر وقت مزہ چاہیے۔اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اصل مزہ گناہ میں ہے، نیکی میں نہیں۔اسی وجہ سے ایسے لوگوں کے بارے میں جو محض دنیاوی مزوں کی خاطر مختلف حیلے بہانوں سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اولئک ہم شرالبریہ کے نام سے مخاطب کیا ہے۔

اسی سورۂ بینہ میں اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے انسانوں کی بات بھی کی ہے۔

أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ

ترجمہ: یہی لوگ بہترین ہیں۔ (سورۃ بینہ،7)

اب یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بہترین کیوں ہیں؟ ان میں کیا ایسی چیز پائی جاتی ہے جو انھیں بدترین سے بالکل ممتاز کرتی ہے۔

اس بات سے تو آپ اتفاق کریں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان فرق اس کے عمل کا ہوتا ہے۔آپ نے محمود و ایاز کا مشہور تاریخی واقعہ سنا ہوگا کہ جب محمود غزنوی نے اپنے ایک غلام احمد ایاز کو غیر معمولی اہمیت دی تو محل کے دیگر وزرا و ملازمین حسد کے باعث ایاز مرحوم سے جلنے لگے۔یہ بات محمود تک پہنچی تو محمود نے اپنے محل میں دربار سجایا اور سب سے کہا کہ جس کو یہاں سے جو شے ملے، وہ لے لے۔سب ملازمین نے اپنی اپنی پسند کی قیمتی چیزیں لیں۔لیکن، ایاز نے کچھ نہیں اٹھایا۔محمود نے اس کی طرف دیکھا تو ایاز محمود کی طرف آیا اور محمود کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔سب حیران رہ گئے۔اس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے محمود غزنوی نے اپنے غلام ایاز کو دیگر لوگوں پر اس لیے سبقت دی کہ اس کا عمل دوسروں سے مختلف تھا۔ یہ مثال میں نے برسبیل تذکرہ اس کتاب میں اپنے موضوع کی مناسبت سے دی ہے۔

ہم یہاں بات کرتے چلے آرہے ہیں شرالبریہ اور خیرالبریہ کی... یعنی اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوق اور بہترین مخلوق۔ان دونوں قسموں کے انسانوں میں جو فرق سب سے نمایاں نظر آتا ہے، وہ ان کے عمل کا۔

آیئے، ہم قرآن کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں کہ خیرالبریہ اور شرالبریہ کے اعمال میں کیا فرق ہے؟

شر البریہ یعنی بدترین لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ

فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا (سورہ بینہ،6)

خیر البریہ یعنی بہترین لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (سورہ بینہ، آیت 7)

عمل صالح کی تعریف قرآن کریم میں دیگر جگہوں پر موجود ہے۔جیسے، سورہ عصر میں ہے:

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اور حق بات پھیلاتے ہیں اور صبر کی بات کرتے ہیں۔ (سورۃ العصر،3)

یہ لوگ اپنی خواہش پر ڈھٹائی سے جمے نہیں رہتے، بلکہ حق کا پرچار کرتے ہیں اور جب آزمائش آتی ہے تو صبر کرتے ہیں۔تو پھر، ان لوگوں کو کیا انعام واکرام ہونے والا ہے؟

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ

ترجمہ: مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے، ان کیلئے بے انتہا بدلہ ہے۔

(سورۃ التین،6)

اگر ہم اپنے ماڈل کی روشنی میں بات کریں تو یوں کہیں گے کہ وہ نفس امارہ یا نفس لوامہ کی کیفیت میں زندگی نہیں گزارتے، بلکہ نفس مطمئنہ کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مجھ سے راضی ہیں اور میں اُن سے راضی ہوں۔

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ

(سورہ بینہ،8)

قرآن کریم میں خاص کر صحابہ کرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بات فرمائی گئی:

وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ وَالَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ
بِاِحۡسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ وَاَعَدَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ تَحۡتَهَا
الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ

ترجمہ: اور جو لوگ قدیم میں پہلے ہجرت کرنے والوں اور مدد دینے والوں میں سے ہیں اور وہ لوگ جو نیکی میں ان کی پیروی کرنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔ (سورۃ التوبہ،100)

تاہم، مفسرین نے اس پر یہ بحث کی ہے کہ اس آیت میں ان تمام انسانوں کی طرف اشارہ ہے جو صحابہ کرام والی صفات رکھتے ہوں۔ (ہم اگرچہ سوائے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے، کسی دوسرے فرد پر یہ قطعی جواز نہیں رکھتے کہ اس کے بارے میں یہ کہہ سکیں کہ اللہ اس سے راضی ہے، تاہم جس فرد میں یہ علامات وصفات پائی جاتی ہوں، اس کے بارے میں یہ ظن ضرور کیا جاسکتا ہے۔)

وہ صفات وعلامات جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے

چلئے، ہم اس بحث کو صحابہ کرام ہی تک محدود کرتے ہیں۔ سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے

کہ وہ کون سی صفات ہیں جو صحابہ کرام میں پائی گئیں کہ جن کی وجہ سے اللہ عزوجل نے ان سے رضا کا پروانہ انھیں اس دنیاوی زندگی ہی میں عطا کر دیا۔

صحابہ کرام کیلئے ایسا کیوں کر ممکن ہوا؟ اس سوال کا جواب آگے چل کر اللہ تعالیٰ خود ہی سورۃ الفرقان میں دے دیا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِيۡنَ يَمۡشُوۡنَ عَلَى الۡاَرۡضِ هَوۡنًا
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا

ترجمہ: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ اُن سے (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں۔

(سورۃ الفرقان،63)

سورۃ الفرقان کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ''عباد الرحمٰن'' کے عنوان سے اپنے خاص بندوں کی صفات وخصوصیات کا ذکر کیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یعنی انھیں اللہ تعالیٰ کا جو پیغام ملتا ہے، اس پر ہو بہو ویسے کا ویسا عمل کرتے ہیں یا کم از کم اس پر بالکل ویسے ہی عمل کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جب حق کا پیغام آتا ہے تو صدیق بن جاتے ہیں اور بے چون و چرا حق کی شہادت دیتے ہیں۔ ایمان بالغیب پر فائز ہوتے ہیں۔ بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں یہ حقیقت معلوم ہوچکی ہوتی ہے کہ محض انسانی عقل یہ کام نہیں کرسکتی، انسانی عقل اس مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ مقام صرف اور صرف وحی کے تابع ہونے کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس دنیا میں (زمین پر انسان کی آمد سے لے کر قیامت تک) دو قسم کے لوگ ہی وجود رکھتے ہیں...

دو قسم کے لوگ

یہاں تک ہم یہ جان چکے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں اور آخرت میں بھی اسی بنیاد پر دو قسم کے لوگ ہوں گی۔ ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جن کیلئے جہنم کا راستہ کھلا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنت جن کی منتظر ہے۔

البتہ ان دونوں انتہائی قسموں کے درمیان ایک اور قسم کے لوگ بھی ہیں جنھیں ابھی حساب کتاب سے گزرنا ہے۔ یہ وہ خطا کار لوگ ہیں جنھوں نے جانے اَن جانے خطائیں کیں، لیکن وہ اپنے کیے پر نادم ہیں۔ گویا، یہ وہ لوگ ہیں جن کا نتیجہ ابھی نہیں نکلا کہ وہ اپنے امتحان میں ناکام ہیں یا کامیاب ہیں۔

اب اس دنیا میں، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے تئیں یہ جانیں کہ میں اپنی ذات میں مذکورہ بالا تینوں نفسوں کی کیفیات (نفس امارہ، نفس لوامہ یا نفس مطمئنہ) میں سے زندگی کے زیادہ تر اوقات میں کس نفسی کیفیت میں زندگی بسر کرتا ہوں۔ اگر آپ نفس امارہ میں زیادہ تر وقت گزارتے ہیں تو گناہ کا احساس تک نہیں ہوگا۔ اگر نفس لوامہ کی کیفیت میں زندگی بسر کی جا رہی ہے... جسے ہم ضمیر سے تعبیر کر سکتے ہیں... تو گناہ تو نہیں چھوٹتا، لیکن گناہ کا مزہ ضرور کرکرا ہو جاتا ہے۔

جو لوگ نفس لوامہ کی کیفیات پر توجہ دیتے ہیں، اکثر خود بہ خود نفس مطمئنہ کی کیفیت میں

داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ نفس مطمئنہ کی کیفیت کا تجربہ اکثر کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ روحانی وجود کی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ سمجھنے کا ہے کہ انسان گاہے گاہے مختلف نفسوں کے درمیان زندگی گزارتا رہتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ساتھ خاکی اور روحانی وجود عطا کیے ہیں۔ چنانچہ جب آدمی نفس مطمئنہ کی کیفیت میں ہوتا ہے تو اُس وقت اس پر اس کا روحانی وجود غالب ہوتا ہے اور جب وہ نفس امارہ کی کیفیت میں ہوتا ہے تو اس وقت اس پر اس کا خاکی وجود غالب ہوتا ہے۔

یہاں میں دوبارہ نفسیات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ہم پہلے یہ تحریر کر چکے ہیں کہ نفسیات نے بتایا کہ سپر ایگو قانون اور ضابطہ بناتا ہے۔ نفسیات کی رُو سے اگر سپر ایگو کے قوانین کو انا (ایگو) نے قبول کر لیا تو آپ خود شناسی (Self actualization) کی طرف چلے جائیں گے۔ گویا، اگر انا نے ثالث کی حیثیت سے سپر ایگو کے بنائے ضابطوں کی تصدیق کر دی اور اسے درست قرار دے دیا تو ہم خود کو جاننے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو نفسیات نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔

یہاں یہ بھی وضاحت کرتے چلیں کہ نفسیات نے جو بھی غور و فکر کیا اور اس کی بنیاد پر قانون سازی کی، وہ سب یک طرفہ تھی۔ نفسیات نے صرف اور صرف علم کسبی سے استفادہ کیا۔ چنانچہ اسے جو ظاہری اور دنیاوی اعتبار سے بلند تر دکھائی دیا، اسی کو خدا مانا۔ پھر کیا ہوا؟ جب قارون اس دنیا کا امیر ترین آدمی دکھائی دیا تو نفسیات نے کہا کہ سود لینا درست ہے۔ قارون جو کہہ رہا ہے، وہ بالکل درست ہے، کیوں کہ جس کے پاس دولت ہے، اسی کی بات درست مانی جائے گی۔ انا نے کہا کہ سود لینا چاہیے، سپر ایگو نے تائید کی کہ ضرور لے لینا چاہیے۔ چلو، میں اس کی قانون سازی کر دیتا ہوں۔ لہٰذا، دنیا میں سود کو قانون کا درجہ مل گیا اور اسے قانونی حیثیت سے مل گئی۔ اب سود غیر قانونی نہیں رہا... لیکن، یہ صرف علم کسبی کی

روسے ہے... علم وحی اسے اب بھی غیر قانونی اور غیر جائز ٹھہراتا ہے۔

ایسے ہی انسان کی ایک بنیادی ضرورت جنس (سیکس) ہے۔ سپر ایگو یہ کہتی تھی کہ مرد اور عورت کے ملاپ ایک طریقہ ہونا چاہیے جو اللہ نے انبیا کے ذریعے اس دنیا میں سکھایا ہے۔ ایگو نے کہا کہ اس میں تو بہت سی قباحتیں ہیں، لمبا پروسیس ہے۔ سپر ایگو نے کہا کہ چلو تو پھر، نکاح کے قانون کو ختم کر دیتے ہیں... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر... ہم جنس پرستی کو قانون بنا دیتے ہیں تا کہ کوئی قانونی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ پھر ایسے اربابِ اختیار تلاش کیے گئے جنھوں نے معمولی معاوضے یا رعایتوں کے عوض مذہبی اور قانونی سطح پر ان غیر اسلامی اور حرام افعال کی قانون سازی کر دی تا کہ اس غیر فطری اور غیر اسلامی عمل کیلئے کوئی قانونی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

ایسے میں، اِڈ (Id)، ایگو (Ego) اور سپر ایگو (Super Ego) میں کوئی فرق نہ رہا۔ ایگو اور سپر ایگو کے درمیان فرق ہی انسان اور حیوان کو ممتاز کرتا ہے۔ لیکن، ہوا یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'اِڈ' کی جو چاہت تھی، سپر ایگو نے فوراً کہہ دیا کہ بھئی، اگر قانون چاہیے تو ابھی لیجیے۔ جھٹ پٹ مسودہ تیار ہوا، پارلیمنٹ سے قانون پاس ہوا اور قبیح اور ہلاکت خیز عملوں کو قانون بنا کر اس پر عمل آسان ترین کر دیا گیا۔ قانون بن گیا تو کوئی پابندی نہ رہی کہ کسی کو اس کی ضرورت کیلئے پیسہ دینا ہے تو کیسے دینا ہے، کس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کیسے اٹھنا بیٹھنا ہے۔

یہ تو دین ہے... روحانی علم... جو ہمیں یہ رہنمائی کرتا ہے کہ کسی کی ضرورت پر اُس کی مدد کیسے کرنی ہے، کس کے ساتھ کیسے اٹھنا بیٹھنا ہے، ملنے جلنے کے آداب کیا ہیں، ضرورت مند کی مدد کرنے کی کیا فضیلت ہے، اجنبی کون ہے اور حرمت کے رشتے کیا ہیں، قرضِ حسنہ سے تم کس درجے پر فائز ہوتے ہو، وغیرہ وغیرہ۔

پرفیکٹ ماڈل

ہم ابھی بات کر رہے ہیں قانون اور ضابطے کی۔ ایگو اور سپر ایگو جو قانون بناتے ہیں، وہ ان محدود ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ صرف ایک پہلو کو دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دَور میں، مختلف قوانین بنتے اور ختم ہوتے رہے ہیں۔ اگر انسانی عقل ''کل'' یا ''مکمل'' (پرفیکٹ) ہوتی تو ایسا ممکن نہیں تھا کہ آدمی ایک عمل ایک دور میں قانونی ہو اور کچھ عرصے میں وہی کام غیر قانونی بن جائے۔ تاریخ میں ایک دو مثالیں نہیں، لاتعداد مثالیں مل جائیں گی۔

ہم پہلے اپنی بحث میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ہمیں قانون اور ضابطے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے تو ہم آگے جو بات کرنے جا رہے ہیں، وہ بہتر طور پر سمجھی جا سکتی ہے۔

کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں، ان سب کا ایک نظام عمل مقرر ہے جس پر وہ حد درجہ پابندی کے ساتھ قائم ہیں۔ البتہ یہاں انسان کا استثنا ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جس کسی نظام میں بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہ اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے، کرے اور جو چاہے، نہ کرے۔ زمین اپنے مدار میں گھومتی ہے۔ وہ دوسرے سیاروں کے مدار میں داخل نہیں ہوتی۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک متعین صورت حال جہاں دوسری چیزیں ہمیشہ ایک ہی رخ اختیار کرتی ہیں، انسان کیلئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ کئی رخ اختیار کر سکے، وہ اپنی حدود سے نکل سے دوسروں کی حدود میں داخل ہو کر دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنے لگے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کیلئے راہِ عمل پانے کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو بقیہ کائنات کا ہے۔ بقیہ چیزیں اپنی راہِ عمل خود اپنے ساتھ لاتی ہیں مگر انسان کو اپنی راہِ عمل باہر سے حاصل کرنا ہوگی۔

مطالعہ ومشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ انسان بہت ہی افضل ہونے اور بے شمار اختیارات رکھنے کے باوجود اپنی راہِ عمل خود دریافت نہیں کرسکتا۔ انسان عقل وفہم رکھتا ہے، مگر اس کی عقل اصل مسئلے کی نسبت سے اتنی محدود ہے کہ کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی کوشش سے اس سوال کا جواب معلوم کرسکے۔ پچھلے ہزاروں سال کی تاریخ نے اس بات کو تجرباتی سطح پر ثابت کردیا ہے۔

انسان چاند اور مریخ سے بڑھ کر اس سے آگے بھی کسی سیارے یا ستارے پر پہنچ جائے، یقین جانئے کہ وہ اپنے اس فطری سوال کا جواب حاصل نہیں کرسکتا کہ اس کیلئے عمل کا درست طریقہ کیا ہے۔ وہ چاہے کیسا ہی جدید اور پیچیدہ یا سادہ سیاسی، معاشی یا معاشرتی نظام تشکیل دے لے، وہ اپنے بنیادی مسائل ہی کو حل کرنے سے قاصر رہے گا، کجا یہ کہ وہ پیچیدہ مسائل سے عہدہ برآ ہوسکے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان اتنی مادی ترقی کرنے کے باوجود بھی... بھانت بھانت کے نظام ہائے سیاست ومعیشت ومعاشرت ایجاد کرنے کے بعد بھی... اس تلاش میں ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرے اور کیسے کرے؟

چنانچہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت کے بارے میں انسان کی یہ مجبوری ثابت کرتی ہے کہ اسے اس بارے میں ایک خصوصی رہ نما کی ضرورت ہے۔ اس سے پیغمبر کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کو بامعنی (Meaningful) بنانے کیلئے پیغمبر کا لازمی طور پر محتاج ہے۔

زندگی میں بہترین نتائج حاصل کرنے دو ممکنہ طریقے ہوسکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ آدمی اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے کچھ تجربات کرے اور ان تجربات کی روشنی میں کچھ سیکھے اور اپنے مطلوبہ نتیجے کے قریب تر پہنچے۔ پھر کچھ تجربات کرتے کرتے مطلوبہ نتیجے کے قریب سے قریب ہوتا رہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں جو نتیجہ چاہتا ہوں، وہ اگر پہلے سے کوئی

حاصل کر چکا ہے تو میں اس کے اختیار کردہ طریق کار کو خود بھی اختیار کروں۔

پہلا طریقہ موثر ہے، اگرچہ بہت زیادہ وقت طلب ہے۔ دوسرا طریقہ پہلے طریقے سے کہیں زیادہ موثر ہے اور اس کی افادیت کئی چند ہے، کیوں کہ دوسرے طریقے میں آپ اپنے تئیں بہت سی ٹھوکروں سے بچ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کو آگے بڑھائیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ انسانی تاریخ میں ایک شخصیت ایسے پرفیکٹ ماڈل کے طور پر موجود ہے جنھوں نے دنیا کی تمام تر کامیابیاں حاصل کیں اور اُن کی زندگی بلا اختلاف پیروی کے قابل ہے۔ اور وہ Perfect اور Ultimate ماڈل ہیں... محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدس!

نفسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم این ایل پی میں Modeling کے نام سے باقاعدہ ایک موضوع ہے جسے پڑھایا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے If any body can do, you can do by following the strategy of the concern person. یعنی آپ جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ سے پہلے ایسا ہی کچھ پہلے کوئی کر چکا ہے تو اس کے لائحہ عمل کو اختیار کر کے آپ وہی نتائج خود بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

ایک تھیراپسٹ کی حیثیت سے میں اپنی بات کروں تو مجھ سے جو لوگ اپنے نفسیاتی مسائل کیلئے رابطہ کرتے ہیں، میں انھیں بہترین مشورہ دینے کے قابل اس لیے ہوتا ہوں کہ میرے پاس آں حضرت ﷺ کی سیرت کی شکل میں مکمل اور پرفیکٹ ماڈل ہے۔

چنانچہ جب کسی نے اپنا بے خوابی کا مسئلہ بیان کیا تو میں نے آں حضرت ﷺ کا ماڈل پیش کیا کہ سونا کیسے ہے، کب سونا ہے، کن چیزوں کا خیال رکھنا ہے، کن چیزوں سے بچنا ہے، کس پہلو سونا ہے، کیا پڑھ کر سونا ہے، کیا سوچتے ہوئے سونا ہے، کیا تزکیہ کر کے سونا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے غور کیا اور ان کی روشنی میں ایک تکنیک بنالی۔ یوں، میں ایک بہترین تھیراپسٹ بن گیا۔ ایسے ہی لوگوں کا بہت بڑا مسئلہ وزن میں زیادتی ہے۔ اس حوالے سے میں نے سنت نبوی ﷺ کے اصول جمع کیے، ان

کا اطلاق کیا اور لوگوں کو بتایا کہ اگر وہ فطری اصولوں کے مطابق اپنا وزن کم کرنا چاہتے ہیں تو یہ کریں۔

دوسری جانب دنیا کے اخلاقی، جسمانی اور روحانی تنزل کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ انسان نے اپنی حیوانی جبلت (نفس امارہ) کی تسلی کیلئے غیر فطری قوانین بنانے شروع کر دیے۔ اس کے مقابلے میں، یہ بات کہ برائی ہمیشہ برائی ہی رہے گی، ہمیں علم وحی سے ہی پتا چلے گا۔

انسان ایسا کیوں کر رہا ہے؟ انسان کیوں کبھی فرعون تو کبھی ہامان تو کبھی قارون اور کبھی ابوجہل بن جاتا ہے... کیوں؟ انسان اپنے نفس امارہ کی ضروریات پوری کرنے کیلئے کیا کرتا ہے؟ اس دنیا میں انسان کی حیثیت سے رہنے اور بقا کیلئے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟ انسان کو اس دنیا میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کیلئے درج ذیل چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے:

مال یعنی پیسہ اور دولت

کمال یعنی صلاحیت و مہارت

جمال یعنی حُسن اور خوب صورتی

نوال یعنی عطا/ قرب

اس دنیا میں ہر انسان کے پاس اپنی ان ضروریات کو پورا کرنے کیلئے دو اختیارات ہیں۔ اب فرض کیجیے، مجھے دنیا میں اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے پیسہ چاہیے۔ ایک اختیار تو یہ ہے کہ میں سود پر مال حاصل کروں یا سود پر مال دوں تا کہ اس سے میرے پاس مزید پیسہ آئے۔ یا دوسرا اختیار یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ: آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے اللہ ہی کے ہیں۔

(سورۃ المنافقون، آیت 7)

اس لیے، میں اللہ تعالیٰ کے خزانوں سے استفادے کیلئے اللہ سے مانگوں۔

ایسے ہی میں کمال یعنی مہارت (اسکلز) حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً، میں انجینئر یا ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں، سائنس داں یا خلانورد بننا چاہتا ہوں، اس دنیا کا سفر کر کے دنیا کو کھنگالنے کی خواہش ہے... تو یہاں بھی یہ شرط عائد ہوگی کہ میں اپنے نفس امارہ کیلئے سب کچھ سیکھ رہا ہوں یا نفس مطمئنہ کیلئے یہ تمام کوشش و محنت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ کمالات اللہ کے بندوں کے پاس ہیں یا اللہ کے پاس ہیں؟ کمالات میرا کمال ہیں یا اللہ کی عطا ہیں؟ فرعون کے دربار کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کمالات فرعون کے جادوگروں کے پاس ہیں یا اللہ کے نبی موسیٰ کے پاس ہیں؟

انسان کی ایک ضرورت جمال ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جمیل ہے، حسین اور اس نے ہمیں بھی جمال بنایا ہے۔ چونکہ وہ خود حسین ہے، اس لیے اس نے ہمیں بھی حُسن عطا کیا ہے۔ انسان کے اندر خود کو حسین رکھنے اور بنانے کی خواہش موجود ہے۔ ہم خود کو حسین بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم خود کو اس لیے حسین بنا رہے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے احسن طریقے سے حاضر ہوں... خواہ معاملہ رخ کا ہو یا حلیہ کا... یا پھر اس لیے کہ مجھ سے لوگ متاثر ہوں۔

ایسے ہی نوال یعنی عطا ہے۔ ہمیں کسی شے کی طلب ہے تو ہم بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہی سب خزانے ہیں۔ اس لیے جھوٹ بولتے ہیں تا کہ جس سے جھوٹ بولا گیا ہے، اس سے کچھ مل جائے۔ اگر جھوٹ نہیں بولیں گے، سچ نہیں چھپائیں گے تو وہ شخص ہماری مدد نہیں کرے گا۔ کمائی کی خاطر حلال اور حرام کی تمیز نہیں کرتے، کیوں کہ اس سے پیسہ کم ہوگا۔ حرام ذرائع سے حاصل کریں گے تو بہت سا پیسہ اور دولت کما سکیں گے۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ ہمیں یہ یقین نہیں کہ سب کچھ دینے والا اللہ ہے۔ اگر واقعی یہ

یقین ہوتا تو کبھی جھوٹ بول کر دوسروں کا حق نہ دباتے، کبھی رشوت نہ لیتے اور نہ حرام خوری کے مرتکب ہوتے۔ چنانچہ ان دنیاوی چیزوں کی خاطر نفس مطمئنہ کو چھوڑ کر نفس امارہ کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

ظاہر میں دیکھیں تو خوب ملتا بھی ہے، لیکن اس کے پاس اس کائنات کی سب سے بڑی دولت سکون اور اطمینان نہیں ہے، کیوں کہ وہ نفس مطمئنہ کی سطح پر اپنی زندگی بسر نہیں کر رہا۔

وہ تمام لوگ جو اپنی دنیاوی ضروریات پوری کرنے کیلئے نفس امارہ کے تقاضوں کے مطابق غلط کام کرتے ہیں، کیا نہیں سوچتے کہ وہ جس سے مانگ رہے ہیں، وہ خود محتاج ہے۔ کیا انھوں نے کبھی سوچا کہ ہم جس سے لینا چاہ رہے ہیں، اسے کس نے دیا ہے؟ کیا غور کیا کہ ہم جس کی تعریف کر رہے ہیں، وہ خود ذلیل کاموں میں پڑا ہوا ہے۔ اگر عزت اور تعریف کے لائق ہوتا تو ایسے گھٹیا کام کیوں کرتا۔ حد یہ ہے کہ اب تو ہم نے زندوں کو چھوڑ کر مُردوں سے بھی مانگنا شروع کر دیا ہے۔ ہم اللہ عزوجل کو ایسے بھولے ہیں کہ دوسروں کی قبروں کو دیکھ کر بھی یہ یاد نہیں آتا کہ یہ لوگ ہماری ہی طرح کے انسان تھے اور اب یہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو ہمارے بیڑا کیا پار کریں گے!

یاد رکھیے، انسان کو اس دنیا کی زندگی میں سب سے زیادہ دوسرے انسان کی قربت چاہیے۔ انسان آج کے مشینی دور میں دوسرے انسانوں سے دُور ہو گیا ہے۔ پہلے تو چلو، صرف مشین تھی، اب تو ایسی apps بھی ہیں جنھوں نے اس ابتری میں رہی سہی کسر بھی نہ چھوڑی۔ انسانی تاریخ میں کبھی اتنے نفسیاتی آلام روئے زمین پر نہیں پھیلے جتنے آج ہیں، کیوں کہ آج کا انسان انسانی تاریخ میں کبھی انسان سے اتنا دور نہیں ہوا تھا۔ اب تو حال یہ ہے کہ اپنے سگے رشتوں کا خیال بھی نہیں رہا کہ بیٹے یا بیٹی کی حیثیت سے اپنے ماں باپ کی کیا ذمے داریاں مجھ پر ہیں اور کیا میں وہ پورا کر رہا ہوں یا کر رہی ہوں۔ مردوں کو بیویوں

سے مل بیٹھ کر بات کرنے کی فرصت نہیں اور بیویوں کے پاس شوہروں سے اپنے دل کی باتیں کرنے کی مہلت نہیں ہے۔ بہن بھائی، اہل محلہ اور اہل علاقہ ایک دوسرے کو پہچانتے تک نہیں ہیں۔ ان دوریوں کی وجہ سے انسان بے چین اور پریشان ہے۔

اگر ہم ایک دوسرے سے تعلقات رکھتے بھی ہیں تو ان کے معیارات بدل گئے ہیں۔ اب ہم انسان کی بنیادی فطری ضروریات کیلئے ایک دوسرے سے نہیں ملتے بلکہ مادی اور خاص کر، مالی ضروریات پوری کرنا چاہتے ہیں۔ انسانوں نے انسانوں کا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے، مگر اپنی مادی اغراض پوری کرنے کی فکر ضرور رہتی ہے۔

یاد رکھیے، انسان کی بہت بڑی ضرورت انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی کہ انسان دوسرے انسان کے قریب ہو۔ لیکن، اب حال یہ ہے کہ معاملہ مال کا ہو، جمال کا ہو یا نوال کا... ہر صورت میں کش مکش نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئن کے درمیان جاری ہے۔ اس کش مکش کے دوران آدمی کو روحانی سطح پر تین مراتب سے گزرنا پڑتا ہے...

شخصی نمو اور تربیت کیلئے

7 ،اقدامات

جب تک شخصی تربیت نہیں ہوگی،
اُس وقت تک انقلاب نہیں آسکتا

جب خود شناسی کی بات آتی ہے تو اگلا مرحلہ آدمی کی بہتری اور نمو کا ہوتا ہے۔ آج پوری دنیا کے مفکرین... مادی اور ظاہری سطح پر ہی سہی... چونکہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ انسانی زندگی میں مسلسل تغیر ہے، لہٰذا، انسان کی بقا کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ خود کو بدلتا رہے۔ یہاں بدلنے سے مُراد، اپنے اندر بہتری لانا ہے تاکہ آپ اپنی شخصیت اور مستقبل کو بہتر سے بہتر کرسکیں۔ چنانچہ گزشتہ پینتیس چالیس برس میں Personal Development یا Self Growth کے موضوع میں عوام کی دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

پرسنل ڈیولپمنٹ کو ہم اُردو میں ''شخصی نمو'' کہہ سکتے ہیں۔ شخصی نمو ہوگی تو آدمی کی شخصیت میں بہتری آئے گی۔ اگر شخصی اصلاح اور تربیت نہیں ہوگی، اس وقت تک کسی ملک یا خطے میں انقلاب یا بہتری نہیں آسکتی۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ کی زندگی کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ بات پتا چلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت ﷺ کے ذریعے

چونکہ قیامت تک کے زمانوں میں انقلاب لانا تھا، اس لیے قیامت تک کے انسانوں کی اصلاح اور تربیت کیلئے چند قوی خطوط پر آں حضرت ﷺ کی تربیت کا انتظام بھی کیا۔

یوں تو پورا قرآن ہی انسان کی شخصی بہتری اور تربیت کی رہ نمائی کیلئے ہے، تاہم اگر ایک خاص پہلو سے غور کیا جائے تو ہم پر یہ نکتہ آشکار ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دَور میں انسان کی انفرادی اور شخصی بہتری اور تربیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مکی دور کی آیات میں تربیت پر توجہ ہے تو مدنی دور کی آیات میں، سماجی اور معاشرتی ڈھانچے کو مضبوطی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

آں حضرت ﷺ جو خاتم الانبیا ہیں، ان کے ذریعے جہاں انسان کو روحانی اور اخروی سطح پر قیامت تک کیلئے رہ نمائی فراہم کیا جانا مقصود تھا، وہاں انسان کی ایک بنیادی ضرورت ''شخصی نمو'' کیلئے بھی دستورِ عمل اور نصاب (سلیبس) کی ضرورت بہ ہر کیف تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ضرورت کی تکمیل کیلئے سورۂ مزمل میں وہ ہدایات بیان کردیں جو انسان کی شخصی نمو اور بہتری کیلئے ضروری ہیں۔

قرآن کریم کے پارہ انتیس میں سورۂ مزمل کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت ﷺ کے ذریعے ہمیں سات ایسے کام کرنے کو کہا ہے کہ جن کے ذریعے ہم اپنی شخصیت اور پھر زندگی کو بہتر سے بہتر کرسکتے ہیں۔

سورہ مزمل کا تعارف

سورۂ مزمل بعثت نبوت کے ابتدائی دور کی سورتوں میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئی نئی اعلانیہ تبلیغ شروع کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اپنی چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا، يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ یعنی اے کپڑا لپیٹ کر اوڑھنے والے۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ

کو مزمل کے نام سے مخاطب فرمایا گیا۔ اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ہوا۔

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ آں حضرت ﷺ کی تربیت کیلئے سات ایسے کاموں کا حکم فرما رہے ہیں جو دنیا میں ان کی فرائض کی بجا آوری میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ان کاموں کے ذریعے آں حضرت ﷺ کے اندر وہ سکت اور استطاعت پیدا کرنا مقصود ہے کہ آں حضرت ﷺ زندگی میں آئندہ آنے والی مشقتوں اور مسائل کو جھیل کر اپنے منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔

خود آں حضرت ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ دنیا میں تمام انبیا کو جتنی تکالیف دی گئیں، ان میں سے سب سے زیادہ آں حضرت ﷺ نے جھیلی ہیں۔ ظاہر ہے، جب آدمی کسی بڑے مقصد کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو اسے بڑی رکاوٹوں سے سابقہ بھی پڑتا ہے اور اپنے راستے پر ثابت قدم وہی رہتے ہیں جن کی تربیت ٹھوس بنیادوں پر ہوتی ہے۔ آج کے مغربی افکار سے پتا چلتا ہے کہ ثابت قدم رہنے کیلئے شرطِ یہ ہے کہ آدمی کا مقصد یا منزل واضح ہو اور یہ مقصد اُس کی شوق یا جنون (Passion) سے ہم آہنگ ہو۔ لیکن، حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کی شخصی تربیت جان دار نہ ہو تو کبھی نہ کبھی زندگی کے مسائل اور آلام اسے پیچھے دھکیل کر اسے کمفرٹ زون میں رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسی لیے، دنیا کی بڑی تعداد رواجی اور عوامی زندگی گزارتی ہے۔

اس کے مقابلے میں، بھرپور عزم کے ساتھ زندگی گزارنے کیلئے شخصیت کا مضبوط ہونا ضروری ہے... اور شخصیت کی مضبوطی کیلئے قرآنی پروگرام کے تحت درج ذیل سات اقدامات کے ذریعے اپنی شخصی تربیت کرنا بہت ضروری ہے۔

پہلا کام رات کا مختصر قیام

سورہ مزمل کی ابتدائی دس آیات میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝

ترجمہ: اے چادر لپیٹنے والے! رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کیلئے) کھڑے ہو جایا کرو، رات کا آدھا حصہ یا آدھے سے کچھ کم کر لو، یا اُس سے کچھ زیادہ کر لو۔ اور قرآن کی تلاوت اطمینان سے صاف صاف کیا کرو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ بے شک رات کے وقت اٹھنا ہی ایسا عمل ہے جس سے نفس اچھی طرح کچلا جاتا ہے، اور یہ بات بھی بہتر طریقے پر کہی جاتی ہے۔ دن میں تو لمبی مصروفیت میں رواں دواں رہتے ہو۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو، اور سب سے الگ ہو کر پورے کے پورے اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے اسی کو کارساز بنالو۔ اور جو باتیں یہ (کافر لوگ) کہتے ہیں، ان پر صبر سے کام لو، اور خوب صورتی کے ساتھ ان سے کنارہ کر لو۔ (سورۃ المزمل، 1 تا 10)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تربیت کیلئے جو پہلا حکم دیا ہے، وہ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا جسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں قیام کر لیا جائے۔ مراد، تہجد کی نماز ہے۔ یہاں قیام کا عمل، آرام کے متضاد ہے۔ کیوں کہ رات کا قیام، انتہائی مشکل کام ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس مشکل اور مشقت کی وضاحت إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ کہہ کر فرما دی ہے۔

مفسر تفسیر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ رات کو اٹھنے اور عبادت کرنے سے نفس کو زیر کرنے اور زبان کو درست کرنے میں مدد ملتی ہے۔ تہجد کی نماز کی خوبی یہ ہے کہ چونکہ یہ آدھی رات کو

ادا کی جاتی ہے، لہٰذا اس وقت انتہائی توجہ اور یک سوئی ہوتی ہے جو تمام دن ممکن نہیں ہوتی۔ چنانچہ دل اور زبان ایک ہو جاتے ہیں اور تلاوت کے جو الفاظ زبان سے نکلتے ہیں، دل میں گڑ جاتے ہیں۔ دن کی نسبت رات کی تنہائی میں معنی خوب ذہن نشیں ہوتے ہیں۔ دن بھیڑ چال اور کمائی دھمائی کے شور وغل کا وقت ہے۔ ایسے میں آدمی کیلئے اپنے معاشی سرگرمیوں سے توجہ ہٹانا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔

اس آیت سے اس بات کی تائید بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن کو معاشی سرگرمیوں اور کمانے دھمانے کیلئے بنایا ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں کہ آدمی خالصۃً عبادت کیلئے خود کو یک سو اور فارغ کر سکے۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشاد گرامی ہے:

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ۖ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا

ترجمہ: اور، ہم نے رات اور دن کو دو نشانیوں کے طور پر پیدا کیا ہے۔ پھر، رات کی نشانی کو تو اندھیری بنا دیا، اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تا کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو۔ اور تا کہ تمہیں سالوں کی گنتی اور (مہینوں کا) حساب معلوم ہو سکے۔ اور، ہم نے ہر چیز کو الگ الگ واضح کر دیا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل، 12)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دو کا یہاں بیان فرمایا ہے کہ دن رات الگ الگ بنائے گئے ہیں۔ دن کو روشن کیا گیا تا کہ اس میں آپ اللہ کا فضل یعنی روزی تلاش کریں، صنعت وحرفت کا کام کر سکیں جبکہ رات کو تاریک کر دیا تا کہ آپ آرام کر سکیں۔

اب آپ دوبارہ سورہ مزمل کی آیت پر غور کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آں

حضرت ﷺ کو الا قلیلا کہہ کر یہ تاکید بھی کر دی کہ پوری رات جاگ کر عبادت نہ کریں، کیوں کہ رات کا پہلا مقصد آرام کرنا ہے... تنہائی کی عبادت یعنی تہجد کی نماز کا حکم تو اس لیے دیا گیا ہے کہ آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قوی اور آپ کے اندر روحانی قوت پیدا ہو۔

رات کے قیام سے انسانی نفس کی تربیت ہوتی ہے۔ تہجد کی نماز آدمی کے نفس کو ''لوامہ'' سے ''مطمئنہ'' کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دیر سے سونے اور دیر سے جاگنے والا نفس ''لوامہ'' کی کیفیت میں ہوتا ہے۔

دوسرا کام قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا

سورہ مزمل کی چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی تربیت کیلئے جو دوسرا کام تفویض کیا ہے، وہ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اگر اپنی شخصیت میں مضبوطی اور بہتری لانا چاہتے ہیں تو آپ کو قرآن پڑھنا ہوگا... ٹھہر ٹھہر کر... اہتمام کے ساتھ۔

گویا، اس آیت میں دو حکم موجود ہیں۔ اول، قرآن کا مطالعہ؛ دوم، ٹھہر ٹھہر کر۔

جو آدمی اپنے اندر بہتری لانا چاہتا ہے، اس کیلئے ان دو شرائط پر عمل کرنا لازم ہے۔ اول تو ہم روزانہ کتنا قرآن پڑھتے ہیں اور جو لوگ قرآن پڑھتے ہیں، ان میں سے بھی کتنے ایسے ہیں جو محض ورق گردانی کرتے ہیں۔

قرآنی حکم ترتیلا سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کو محض رٹ نہ لیا جائے بلکہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن قرآن کے قاری سے کہا جائے گا کہ تم قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھتے جاؤ جیسا کہ دنیا میں ترتیل سے پڑھتے تھے، اور جنت کے اگلے درجات پر چڑھتے جاؤ۔ یہاں تک کہ جہاں تمہاری آخری آیت ختم ہو، وہاں جنت میں تمہارا آخری درجہ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بلا اختلاف سب سے بڑا مفسر قرآن مانا جاتا ہے، وہ اس آیت کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ریت کی طرح قرآن مت پڑھو اور شعروں کی طرح بدتہذیبی سے نہ پڑھو بلکہ اس کے حیران کن نکات پر غور کرو، دلوں پر اثر لیتے جاؤ اور اس چکر میں نہ رہو کہ جلد سورت ختم ہو۔ (بغوی)

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں آیا اور اس نے بتایا کہ میں نے مفصل کی تمام سورتیں آج رات ایک ہی رکعت میں ختم کر ڈالیں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ''اس کا مطلب ہے، تم نے شعروں کی طرح جلدی جلدی قرآن پڑھا ہوگا۔'' ظاہر ہے، جب آدمی جلدی جلدی قرآن پڑھے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، کیوں کر سمجھ پائے گا۔

قرآن کریم کی ترتیب کا اصل مقصد اس میں تدبر ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں، لَاَن أقرأ البقرةَ و آل عمران أرتِّلُہما و أتدبَّرُہما أحبُّ اِلیَّ مِن اَن اقرأ القرآنَ کلَّہ بذرمة (التبیان، صفحہ 89) یعنی ترتیل وتدبر کے ساتھ سورۂ بقرہ وآلِ عمران پڑھوں یہ مجھے پسند ہے اس سے کہ تیز رفتاری سے پورا قرآن پڑھوں۔

حضرت عبیدہ ملکی مرفوعاً نقل کرتے ہیں، یَا أہلَ القرآنِ لا توسَّدوا القرآنَ واتلوہ حقَّ تلاوتِہ آناءَ اللیلِ وآناءَ النہارِ وافشوہ وتدبَّروا ما فیہ لعلکم تُفلحون (اتقان، ج ا، ص ۱۳۷) یعنی ''اے اہل قرآن، قرآن میں جلد بازی نہ کرو، دن رات میں ویسے پڑھو جیسا کہ اس کا حق ہے، اس میں تدبر و تفکر کرو تا کہ کامیاب ہو جاؤ۔''

میں اپنے قارئین کو یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ آپ روزانہ کی مصروفیات میں چند منٹ قرآن کی تلاوت اور ترجمے کا معمول ضرور بنائیں۔ علما نے لکھا ہے کہ قرآن کو سال میں دو مرتبہ ختم کرنا اس کا حق ہے۔ اور یہ کوئی مشکل کام نہیں، اگر باقاعدگی سے روزانہ تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھا جائے تو یہ ممکن، اور ایک سال میں دو مرتبہ قرآن پڑھنا اور اس کے پیغام سے

واقف ہونا بہت آسان ہو سکتا ہے۔

تیسرا کام اللہ کا نام لیتے رہنا

سورہ مزمل کی آٹھویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ

یعنی، اور اپنے رب کا نام لیا کرو۔

اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو نہ بھولے، اسے یاد رکھے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تخلیق کیا ہے اور ہمیں لاتعداد نعمتوں سے نوازا ہے، وہ ہمارا سب سے بڑا محسن ہے۔ محسن کے احسان کا بدلہ اگرچہ ممکن نہیں ہوتا، مگر کم از کم اتنا تو ضرور کرنا چاہیے کہ آدمی اپنے محسن کو یاد رکھے اور اسے اچھے الفاظ میں یاد رکھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارا سب سے بڑا محسن ہے، لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے ہر وقت یاد رکھیں۔ اسی لیے حکم دیا جا رہا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ کہ ہم اللہ کا نام لیتے ہوئے اس کا ذکر کرتے رہیں۔

مفسرین قرآن نے یہاں اس آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تہجد خاص رات کیلئے ہے، لیکن آدمی کو اپنی انسانی ضروریات پوری کرنے کیلئے دن میں کام کاج بھی کرنا پڑتا ہے تا کہ روزی روٹی کا انتظام کر سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دن میں آدمی کو چھوٹ ہے، بلکہ اسے دن میں بھی اپنے خالق اللہ سبحان وتعالیٰ کی حمد وثنا کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ کے نام کے ساتھ ذکر کی سب سے بڑی تاکید ''پانچ وقت کی فرض نماز'' ہے۔

اسلام میں فرض نماز کی اہمیت انتہائی زیادہ ہے، حتیٰ کہ احادیث سے پتا چلتا ہے کہ جو آدمی نماز نہیں پڑھتا، اس کی دیگر نیکیاں بھی قبول نہیں کی جائیں گی۔ ایسے ہی ایمان کے بعد سب سے اہم عمل نماز کو قرار دیا گیا ہے۔ نیز، آدمی سے قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر نماز درست نکلی تو دیگر اعمال کی پوچھ گچھ میں سختی

نہیں کی جائے گی۔

چوتھا کام اللہ ہی کیلئے سب کچھ کرنا

سورہ مزمل کی آٹھویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

یعنی، اورسب سے الگ ہوکراسی کی طرف آجاؤ۔

تبتل کا معنی ہے، اخلاصِ نیت کے ساتھ۔ اوپر جو کام بیان کیا گیا ہے کہ آدمی اللہ کا نام لیتا اور اس کا ذکر کرتا رہے، اس سے یہ اَشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ آدمی ہر وقت اللہ کی طرف دھیان رکھے گا تو وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کیسے پوری کرے گا۔ وہ کیسے اپنے بال بچوں اور کاروبارِ حیات سے نمٹے گا؟ اس لیے یہاں یہ نکتہ وتبتل الیہ تبتیلا کہہ کر یہ نفیس نکتہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مراد یہ نہیں کہ ہم تسبیح ہاتھ میں لیے سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے رہیں... یہ بھی ضروری ہے اوراس کیلئے اپنے روزانہ کے معمولات میں سے کچھ وقت ضرور مختص کرنا چاہیے ... تاہم، ہر دَم، ہر وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا استحضار کریں اور جو کام بھی کریں، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پورا کریں۔

التّحِيّاتُ لِلّٰہِ، وَالصّلوٰاتُ وَالطّيّبَاتُ

ترجمہ: میری تمام عبادتیں... قولی، فعلی اور مالی عبادتیں... اللہ ہی کیلئے ہیں۔

جو کام بھی کررہے ہوں، اس میں نیت یہ ہو کہ وہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشی کیلئے کررہا ہوں۔ آدمی کو یہ استحضار اور احساس ہر وقت ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں جو کچھ کررہا ہوں، وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ میرا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ اس حالت میں، آدمی جب بھی کوئی کام کرے گا، وہ خود سے یہ سوال کرے گا

کہ میں کہیں کوئی گناہ تو نہیں کر رہا؛ میرے ہاتھوں، پیروں، آنکھوں، کانوں سے ایسا کام تو نہیں ہو رہا کہ جو میرے رب کی ناراضی کا سبب بن جائے۔

پانچواں کام ہر مشکل میں صرف اللہ سے مدد لینا

سورہ مزمل کی نویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا

یعنی اسی اللہ کو کارساز بنالو

ہر انسان کے بہت سے کام رکے ہوتے ہیں اور وہ ان سے کم وبیش پریشان بھی ہوتا ہے۔ مضبوط شخصیت رکھنے والا آدمی اس ذاتِ باری تعالیٰ ہی کو اپنا کارساز بناتا ہے۔ اس آیت میں حکم دیا جارہا ہے کہ اپنی شخصیت تربیت کیلئے خود کو ایسا پختہ کرلو کہ ہر کام کیلئے توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہو۔ یہ یقین واثق ہو کہ میرے مسائل میرا اللہ ہی حل کرے گا؛ میں جن پریشانیوں میں گھرا ہوں، ان سے میرا اللہ ہی مجھے نکال سکتا ہے، اور کوئی اس کی قوت نہیں رکھتا۔

اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے تمام چھوٹے بڑے مسائل کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ خاص کر، فرض نمازوں کے بعد اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ ایسے ہی کوئی بڑا مسئلہ یا رکاوٹ ہو تو اللہ تعالیٰ سے صلات الحاجات پڑھ کر دعائیں کی جائیں۔ یہ آں حضرت ﷺ کی سنت ہے کہ جب بھی کوئی اہم کام پیش آئے، دو رکعات نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔

صحابہ کرام اس یقین کی انتہا پر تھے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام کے جوتے کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جاتا تو وہ اللہ تعالیٰ سے مانگتے۔ ہم کم از کم اتنا تو ضرور کریں کہ کوئی بھی مسئلہ ہو تو اللہ تعالیٰ ہی کو اس مسئلے کو حل کرنے والا جانیں اور اپنے اہم مسائل کے حل

کیلئے صلاۃ الحاجات پڑھنے کی عادت اپنائیں۔

چھٹا کام   صبر اختیار کرنا

سورہ مزمل کی دسویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ

یعنی اور لوگ جو (برا بھلا) کہتے ہیں، اس پر صبر کرو۔

آپ جب بھی کچھ اچھا کریں گے، لوگ اس پر باتیں کریں گے۔ کتنے ہی لوگ صرف اس وجہ سے اچھا کام نہیں کرتے کہ انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ ''لوگ کیا کہیں گے'' اور اس خوف کی وجہ سے وہ اچھا کام جانتے بوجھتے، چھوڑ دیتے ہیں۔

اس آیت میں اس کا حل یہ بتایا جا رہا ہے کہ لوگ تو آپ پر طنز کریں گے، برا بھلا کہیں گے، مذاق اڑائیں گے... لیکن، آپ کو ایسے میں ''صبر'' کرنا ہے۔

آں حضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ پر غور کریں، آپ کو معلوم ہے کہ آں حضرت ﷺ کو بہت کچھ کہا گیا... مجنوں، شاعر، جادوگر، پاگل... لیکن ایسے میں آں حضرت ﷺ نے اپنا کام چھوڑا اور نہ ان پر غصہ ہوئے، بلکہ اس آیت کی روشنی میں صبر کرتے اور اپنا مشن پورا کرتے رہے۔ سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں...

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ

یعنی، گزشتہ انبیا کرام کو ان کی قوم کے لوگوں نے ''بے وقوف'' اور ''جھوٹا'' کہا۔ (نعوذ باللہ)۔ آں حضرت ﷺ کے مکی دور کو دیکھ لیجیے کہ کفار نے آپ ﷺ کو کتنی سخت تکالیف پہنچائیں، اور بہت کچھ کہا... اور ایسے میں اللہ تعالیٰ آں حضرت ﷺ کو **وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ** (اور جو باتیں یہ کافر لوگ کہتے ہیں، ان پر صبر سے کام لو) کا حکم فرما رہے ہیں۔

ہونا تو یہ آدمی اگر خود نیکی کی جرات نہیں کر پا رہا تو کم از کم وہ کسی دوسرے نیکی کرنے والے فرد کی نیکی کی حمایت اور حوصلہ افزائی تو کرے یا کم از کم خاموش ہی رہے۔ عین ممکن ہے کہ اس نیکی کی حمایت یا حوصلہ افزائی ہی بخشش کا ذریعہ بن جائے۔ لیکن، معاشرے میں عموماً اس کے برعکس ہی کیا جاتا ہے کہ لوگ خود نیکی نہیں کرتے، اور دوسروں کی نیکی سے بھی تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا اگر کوئی اچھا کام کر رہا ہو تو اس پر تنقید اور تنقیص شروع کر دی جاتی ہے۔ اسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

ساتواں کام   عمدہ طریقے سے کنارہ کشی کرنا

سورہ مزمل کی دسویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا

یعنی ان لوگوں سے دور ہو جاؤ، مگر اچھے طریقے سے

غور کیجیے کہ یہاں لوگوں سے جو آپ کے کام میں رکاوٹ ڈال رہے ہوں، جو لوگ آپ کو برا بھلا کہتے اور طعنہ دیتے ہوں، ان پر صبر تو کرنا ہی ہے، ساتھ ہی ان سے کنارہ کشی بھی اختیار کرنی ہے... مگر اچھے طریقے سے ان سے دور ہونا ہے۔

بعض لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں ان کے اچھے کام پر کچھ کہہ دیا جائے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ترکی بہ ترکی جواب دینے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ خطرے میں ہیں۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے، ان کے غصہ کرنے کی وجہ سے ان کی نیکی ہی برباد ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تمہیں جب لوگ برا بھلا کہیں، طعن و تشنیع کریں تو اول تو صبر کرنا ہے اور پھر بہت احسن طریقے سے، خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتے ہوئے ان سے دُور ہونا ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ تم بھی آہستہ آہستہ ان کے رنگ میں رنگ جاؤ۔

صحبت صالح ترا صالح کنند، صحبت طالع ترا طالع کنند

اس لیے اگر مزید لوگ ان کے ساتھ رہیں گے، تو کچھ عرصے میں آپ کو بھی برائی، برائی نہیں لگے گی۔ پھر یہ ہوگا کہ جو لوگ آپ کو برا کہہ رہے تھے، آپ بھی وہی کچھ کر رہے ہوں گے، جو وہ کر رہے ہیں۔ پھر وہ طعنے دیں گے کہ دیکھا، ہم نہ کہتے تھے کہ ہم ہی درست ہیں۔ حالانکہ وہ درست نہیں، بلکہ آپ ان کے رنگ میں رنگ گئے۔ یہ سب رفتہ رفتہ ہوتا ہے، آدمی کو دوسروں کی صحبت اور بیٹھک سے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ اس لیے حکم دیا جا رہا ہے کہ ایسے لوگوں سے دور ہو جاؤ، ورنہ آپ بھی ویسے ہی ہو سکتے ہیں۔ تاہم، یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ ان لوگوں سے دشمنی نہیں کرنی، بلکہ پیار محبت سے ان سے دور ہو جائیے کہ آپ کے کام میں وہ مزید لوگ روڑے نہ اٹکا سکیں۔

یہ سات نکات اور کام اگر آپ اختیار کریں گے تو آپ کیلئے اپنے اندر تبدیلی اور شخصی بہتری لانا ممکن ہوگا۔ اس کے بغیر چیزیں ظاہری اعتبار سے بہت خوش نما ہو سکتی ہیں، مگر ان میں گہرائی اور ٹھوس پن بہت مشکل ہے۔

دین کے تین مراتب

اسلام، ایمان، احسان

قرآن نے اس کیفیت کی عکاسی یوں کی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ()

ترجمہ: کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے، حالانکہ وہ (حقیقت میں) مومن نہیں ہیں۔

(سورۃ البقرہ،8)

گویا، اسلام اور ایمان دو مختلف درجے ہیں۔ لا الہ الا اللہ کہہ کر آپ اسلام پر تو آتے ہیں، ایمان پر نہیں آتے۔ اسی وجہ سے صرف اسلام پر رہنے والا مسلمان وہ فساد برپا کر رہا ہے کہ جس کی تاریخ میں مثال ہی نہیں ملتی۔ اور ہم اس پر اس غلط فہمی میں خوش ہیں کہ ہم تو جنتی ہیں، بخشے بخشائے ہیں... جیسے یہود و نصاریٰ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایمان پر کیسے آئیں؟

اگلا مرحلہ ہے کہ ہم اسلام پر آ چکے ہیں تو ایمان پر کیسے آئیں؟ اس کا سادہ سا جواب ہے... جب ایمانِ مفصل اختیار کریں گے تو ایمان پر آنے کے قابل ہوں گے۔ ایمان

مفصل کا مطلب ہے کہ تمام وحی پر ایمان، تمام عقائد اور فلسفے پر ایمان جو قرآن اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہم تک پہنچایا ہے۔

یہ وہ مرحلہ ہوگا کہ جب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات ہماری ہر شے پر مقدم نہ ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بیان فرمائی:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

ترجمہ: ایمان والوں کیلئے یہ نبیؐ ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب تر ہیں،

(سورۃ الاحزاب، 6)

سورہ توبہ میں اس سے سخت الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تنبیہ فرما رہے ہیں:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ ()

ترجمہ: (اے پیغمبر! مسلمانوں سے) کہہ دو کہ 'اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، اور تمہارا خاندان اور وہ مال و دولت جو تم نے کمایا ہے، اور وہ کاروبار جس کے مندا ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے، اور وہ رہائشی مکان جو تمہیں پسند ہیں، تمہیں اللہ اور اُس کے رسول سے، اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو منزل تک نہیں پہنچاتا' (سورۃ التوبہ، 24)

یہاں کہنے دیجیے کہ جب اللہ کا قانون اور احکامِ الٰہی ہماری تمام خواہشات اور عقلی حجتوں اور منطقی بحثوں سے بالاتر ہوگا، تب ہم اس مقام پر پہنچنے کے قابل ہوں گے کہ ہم ایمان پر آ گئے ہیں۔ یہی وہ کیفیت ہوگی کہ جسے نفسِ مطمئنہ کی حالت کہا جا سکتا ہے۔

احسان کیا ہے؟

ایمان کے بعد اگلا مرحلہ ''احسان'' کا ہے۔ یہ خود شناسی اور خود آگہی (Self actualization) کا تیسرا مرحلہ ہے۔

عبادت میں ''احسان'' (Excellence) یہ ہے کہ وہ آں حضرت ﷺ کی سنت کے مطابق انتہائی درجے ظاہری و باطنی حسن کے ساتھ ادا کی جائے، جبکہ وہ قلبی امراض (ریا، مقابلہ وغیرہ) سے بھی پاک ہو۔

لغت میں ''احسان'' کا معنی حسین بنانا، صناعت میں عمدگی اور اس میں استحکام پیدا کرنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ()

ترجمہ: اُس (اللہ) نے جو چیز بھی پیدا کی، اسے خوب بنایا۔

(سورۃ السجدہ، 7)

ایسے ہی تیسویں پارے میں قرآن کی ایک آیت بہت معروف ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ()

ترجمہ: ہم (اللہ) نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔

(سورۃ التین، 4)

اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کا حُسن اور اس کا وجود کتنا اہم ہے، کیوں کہ دیگر کسی مخلوق کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات نہیں فرمائی۔

اصطلاح میں ''احسان'' شرعی مطلوب کو حسین ترین طریقہ سے پیش کرنا ہے۔ آں حضرت ﷺ نے حدیث جبریل میں ارشاد فرمایا کہ ''احسان'' یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی اس

طرح عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہو تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے، جس سے مراد ہے کہ بندۂ مؤمن یوں عبادت کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حضور میں ہے، جس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بندہ کے اندر خشیت اور خضوع ہو اور بندہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف کمال توجہ ہو۔

''احسان'' کے بارے میں بھی مختصر تعارف کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بندوں کو ''احسان'' کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ''یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں ''عدل'' اور ''احسان'' کا حکم دیتا ہے۔'' پھر اللہ تعالیٰ اپنے آں حضرت ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: آپ میرے بندوں سے کہہ دیں کہ، وہ حسین ترین قول اختیار کریں۔ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں ''احسان'' (حسن صناعت) اور حسن کارکردگی کا لکھ دیا ہے سو جب تم قتل کرو تو قتل کا حسین ترین طریقہ اختیار کرو اور جب تم ذبح کرو تو ذبح کا حسین ترین اسلوب اختیار کرو۔

اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ قرآن کریم میں اپنے مؤمن بندوں سے فرماتا ہے:

وَاَحۡسِنُوۡا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ

ترجمہ: احسان کرو (یعنی نیکی اختیار کرو)، بے شک اللہ احسان کرنے والوں (نیکی کرنے والوں) سے محبت کرتا ہے۔

(سورۃ البقرہ، 195)

ان فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دین میں شارع کو ہم سے ہر موقع پر اور ہر ایک کے ساتھ ''احسان'' مطلوب ہے۔ قرآن کریم نے احسان کے بیان کیلئے کئی اسالیب اختیار کی ہیں۔ سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ

ترجمہ: احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کیا ہے

(سورۃ الرحمٰن، 60)

دوسری جگہ فرمایا گیا:

اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ

ترجمہ: اگر تم احسان کرو گے تو اپنے ہی فائدے کیلئے کرو گے۔

(سورۃ بنی اسرائیل، 7)

اللہ کی عبادت میں ''احسان'' دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت مشاہدہ سے یا مراقبہ سے کرنا ہے تو ان کی جزا بھی آخرت میں دنیا میں ان کے عمل کی ہم مثل رکھی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ''احسان'' زندگی کے ہر معاملے اور ہر موقع پر شرعاً مطلوب ہے۔

الغرض، ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے شب و روز کے حوالے سے کئی مواقع پر قرآن و حدیث میں ''احسان'' کا ذکر ہے۔ اللہ کی عبادت میں احسان، والدین کے ساتھ احسان، خاوند کا بیویوں کے ساتھ احسان، بیویوں کا خاوند کے ساتھ احسان، بیٹیوں کے ساتھ احسان، بیواؤں، مساکین، اور یتیموں کے ساتھ احسان، ہمسایہ کے ساتھ احسان، نوکروں چاکروں سے احسان، عام انسانوں سے احسان۔ اللہ کی عبادت میں احسان یہ ہے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ

ترجمہ: ''تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے (اللہ) کو دیکھ رہے ہو۔ اگر چہ تم اسے نہیں دیکھتے مگر وہ (اللہ) تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (حدیث جبریل)

قرآن و حدیث کی تعلیمات سے زندگی کے ہر شعبے میں ''احسان'' کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ اب، یہ انسان کی ذمے داری ہے کہ وہ اس انداز سے اپنی زندگی گزارے کہ اس کے ہر پہلو اور ہر معاملے میں، یہ ''حُسن'' دکھائی دے۔ معاملہ عمل کا ہو، دنیا کا ہوا یا

ایمان کا، ہر معاملے میں... حُسن کا اہتمام ضروری ہے۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر... معاملہ دنیاوی ہو یا اخروی... یہی چاہتے ہیں کہ انسان احسان کے درجے پر فائز ہو۔

یہاں آخرت میں احسان کی سطح پر نتیجے کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کامیاب ہونے والے انسانوں کی جو خصوصیات بیان فرمارہے ہیں، ان میں یقیناً جہنم سے حفاظت اور جنت میں داخلہ (اور ساتھ ہی جنت کی نعمتوں کا بیان) بہت ہی مقبول اور مستحسن ہے، تاہم اللہ تعالیٰ ان سب کے بعد جسے ''بہترین نتیجہ'' قرار دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آدمی کو ان تمام نعمتوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی رضا، اللہ رب العزت کی خوشی مل جائے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

ترجمہ: اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے وعدہ کیا ہے اُن باغات کا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اُن پاکیزہ مکانات کا جو سدا بہار باغات میں ہوں گے۔ اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو سب سے بڑی چیز ہے (جو جنت والوں کو نصیب ہوگی)۔ یہی تو زبردست کامیابی ہے۔

(سورۃ التوبہ، 72)

اس بحث کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ احسان دراصل آدمی کی وہ کیفیت ہے کہ جب وہ اپنا کوئی عمل محض جنت کیلئے نہ کرے، بلکہ جنت بنانے والے کیلئے کرے۔ جب مومن احسان کے درجے پر فائز ہوتا ہے تو اس کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، بولنا خاموش رہنا... ہر ہر عمل... تمام طرزِ حیات ایسا ہوگا کہ جہاں وہ دوسروں سے بالکل ممتاز ہو۔ ایسے انسانوں کی سب سے نمایاں مثال ہمارے سامنے صحابہ کرام ہیں جن کے بارے میں پوچھا

جاتا تو بتایا جاتا کہ ''یہ زندہ قرآن ہیں''، کیوں کہ وہ اپنے احسان سے بھرپور لائف اسٹائل کی وجہ سے دوسروں سے یک سر ممتاز تھے۔

واضح رہے، احسان کے درجے پر وہی ہوتا ہے جو نفس مطمئنہ کی کیفیت میں اپنی زندگی گزارنے پر قادر ہو۔ ایسے لوگ عام لوگ نہیں رہتے، غیر معمولی انسان بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں یہ تصدیق کردی:

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ

جزا بھی، سزا بھی

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انسان کے سامنے اس کے اعمال کی جزا (انعام) بیان کیا ہے تو سزا بھی بتادی گئی ہے۔ کئی لوگ یہ اِشکال پیش کردیا کرتے ہیں کہ جناب، جہنم ہی کا تذکرہ پڑھنے کو ملتا ہے اور اگر یہ نہ کیا تو یہ عذاب اور وہ نہ کیا تو وہ عذاب۔ لیکن، یہ اعتراض یا اشکال قرآن فہمی میں کم علمی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر آپ اس زاویے سے قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ قرآن میں اکثر آیات میں جنت کا تذکرہ ہے تاکہ آدمی کے اندر اچھے کاموں کا شوق پیدا ہو اور وہ نیک بنے۔ اس کے مقابلے میں بہت کم آیات ہیں جن میں جہنم کا بیان ہے یا غلط عمل پر تنبیہ یا سزا بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات میں کھول کھول کر انسان کے سامنے اچھے اعمال کا بہترین بدلہ بیان کیا ہے تاکہ انسان اللہ کے قریب ہو۔ البتہ چند مقامات پر یہ بھی بیان کردیا گیا ہے کہ اگر انسان اپنی حرکتوں سے نہیں سدھرے گا اور رحمان کے احکام پر چلنے کی بجائے شیطان کی پیروی کرے گا تو اس کی سزا بھگتے گا۔

انسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ اس میں شوق اور خوف دونوں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا، اگر آدمی جنت کے حصول کے شوق میں عبادت اور نیک عمل کرتا ہے اور جہنم کے عذاب

کے خوف سے برے عمل سے بچتا ہے تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہ بات پسند ہے۔ لیکن، یہ اس سے اوپر ایک اور مقام بھی ہے۔

یہ درجہ احسان کا درجہ ہے... یہ مقام نفس مطمئنہ کا مقام ہے۔

ہم احسان تک کیسے پہنچیں

اس سوال کے جواب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام کے سامنے میں حدیث جبرئیل پیش کردوں۔ یہ حدیث مبارکہ خاصی معروف ہے اور امید ہے کہ اکثر قارئین کے علم میں ہوگی، تاہم، اس موضوع کی مناسبت اور اہمیت کی بنا پر یہاں اس کی تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔ واضح رہے، حدیث جبرئیل کو اسلامی تعلیمات میں بہت بنیادی حیثیت حاصل ہے، کیوں کہ اس حدیث کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے انتہائی بنیادی سوالوں کے جوابات فراہم کردیے ہیں۔ یہ حدیث مبارکہ آں حضرت ﷺ اور سب سے افضل فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے درمیان مکالمہ کی شکل میں ہے۔ یوں، آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس کا فہم بھی آسان تر ہے۔ چونکہ اس حدیث کی افادیت بہت ہی زیادہ ہے اور اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس حدیث کو ''ام السنہ'' کہا گیا ہے، لہٰذا یہ مناسب ہے کہ قارئین کے سامنے حدیث جبرئیل میں بیان کیے گئے ''احسان'' کے نکتے کو بیان کرنے سے پہلے پوری حدیث جبرئیل ہی بیان کردی جائے۔ حدیث جبریل یوں ہے:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ : بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰہِ صَلّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلّمَ ذَاتَ یَوْمٍ إِذْ طَلَعَ رَجُلٌ شَدِیدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیدُ سَوَادِ الشّعْرِ لاَ یُرَی عَلَیْہِ أَثَرُ السّفَرِ وَلاَ یَعْرِفُہُ مِنّا احَدٌ حَتّی جَلَسَ إِلَی النّبِیّ صَلّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلّمَ فَأَسْنَدَ رُکْبَتَہُ إِلَی رُکْبَتِہِ وَضَعَ کَفّیْہِ عَلَی فَخِذَیْہِ وَقَالَ یَا مُحَمّدُ: أَخْبِرْنِی عَنِ الإِسْلاَمِ قَالَ: الإِسْلاَمُ أَنْ تَشْھَدَ أَنْ لاَ إِلَہَ إِلاّ اللّٰہُ وَأَنّ مُحَمّداً رَسُولُ اللہِ وَتُقِیمَ الصّلاَۃَ وَتُؤْتِیَ الزّکَاۃَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجّ الْبَیْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ سَبِیْلاً «. قَالَ صَدَقْتَ، فَعَجِبْنَا لَہُ یَسْأَلُہُ وَیُصَدِّقُہُ ثُمّ قَالَ فَأَخْبِرْنِی عَنِ الإِیمَانِ قَالَ : أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلاَئِکَتِہِ وَکُتُبِہِ وَرُسُلِہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَیْرِہِ وَشَرِّہِ. قَالَ:صَدَقْتَ. قَالَ : فَأَخْبِرْنِی عَنِ الإِحْسَانِ. قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَأَنّكَ تَرَاہُ فَإِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَإِنّہُ یَرَاكَ «. قَالَ فَأَخْبِرْنِی عَنِ السّاعَۃِ قَالَ:مَا الْمَسْئُولُ عَنْھَا بِأَعْلَمَ مِنَ السّائِلِ. قَالَ فَأَخْبِرْنِی عَنْ أَمَارَاتِھَا. قَالَ : » أَنْ تَلِدَ الأَمَۃُ رَبّتَھَا وَأَنْ تَرَی الْحُفَاۃَ الْعُرَاۃَ الْعَالَۃَ رِعَاءَ الشّاءِ یَتَطَاوَلُونَ فِی الْبُنْیَانِ «.قَالَ: ثُمّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِیًّا ثُمّ قَالَ لِی:» یَا عُمَرُ أَتَدْرِی مَنِ السّائِلُ؟ «. قُلْتُ : اللّٰہُ وَرَسُولُہُ أَعْلَمُ. قَالَ :فَإِنّہُ جِبْرِیلُ أَتَاکُمْ یُعَلّمُکُمْ دِینَکُمْ «.

ترجمہ: سیدنا عمر بن خطاب نے یہ حدیث بیان کی ہے، فرمایا، ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی، کالے سیاہ بالوں والا، انتہائی سفید، صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے آیا۔ اس آدمی پر سفر کے اثرات نہیں تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اسے جانتا تھا۔ وہ شخص آکر آں حضرت ﷺ کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گھٹنے آں حضرت ﷺ کے گھٹنوں سے ملا لیے اور اپنی ہتھیلیاں آں حضرت ﷺ کے گھٹنوں پر رکھ کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے۔

آں حضرت ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی

گواہی دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور اگر استطاعت ہو تو (ساری زندگی میں ایک مرتبہ) بیت اللہ کا حج کرو۔

اس شخص نے کہا: مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے۔

آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن اور خیر وشر کی تقدیر پر ایمان لاؤ۔

اس نے کہا: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سچ فرمایا ہے۔ (پھر) کہا: مجھے احسان کے بارے میں بتائیے۔

آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت ایسے کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔

اس شخص نے کہا: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے (کہ قیامت کب آئے گی؟)

آں حضرت ﷺ نے فرمایا: جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔

اس نے کہا: آپؐ اس کی نشانیاں ہی بتا دیں۔

آں حضرت ﷺ نے فرمایا: (قیامت کی نشانیوں میں سے) یہ بھی ہے کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی۔ اور تم دیکھو گے کہ ننگے پیر، ننگے بدن، غریب چرواہے (اونچی) کوٹھیوں میں تکبر کریں گے۔

پھر وہ اجنبی شخص چلا گیا۔

میں (حضرت عمرؓ) تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر آں حضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عمرؓ، کیا تم جانتے ہو کہ یہ سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

''یہ جبریل تھے جو تمہارے پاس تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔''

(صحیح مسلم، حدیث جبریل)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، یہ حدیث اپنی افادیت اور موضوعات کی اہمیت کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ اسی وجہ سے اسی علما اور فقہا نے ''ام السنہ'' قرار دیا ہے۔ مشہور فقیہ ابن رجبؒ کا قول ہے، ''یہ عظیم حدیث تمام دین کی شرح پر مشتمل ہے، اسی لیے آں حضرت ﷺ نے اس کے آخر میں فرمایا کہ 'یہ جبریل تھے جو تمہارے پاس تمہارا دین سکھانے آئے تھے'۔ اس کے بعد آں حضرت ﷺ نے اسلام، ایمان، احسان کے درجات بیان فرمائے، اور ان سب کو دین قرار دیا۔'' [جامع العلوم والحکم]

حدیث جبریل پر گزشتہ چودہ سو سال میں دنیا کی بہت سی زبانوں میں لاتعداد کتب لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں اس کتاب کے موضوع کی مناسبت سے ہم صرف ''احسان'' کو موضوعِ بحث بنا رہے ہیں۔ حدیث جبریل میں جو سوالات حضرت جبریل نے آں حضرت ﷺ سے کیے ہیں، ان میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ احسان کیا ہے۔ آں حضرت ﷺ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنَّكَ إِنْ لَا تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ

کہ ''اللہ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو؛ ورنہ وہ تو تمہیں دیکھتا ہی ہے۔''

یہ احسان ہے۔ گویا، آدمی جیسے کسی کو اپنے سامنے پاتا ہے تو خود کو بہت سے کاموں سے محتاط کر لیتا ہے کہ تنہائی میں ان معاملات میں عموماً احتیاط نہیں برتی جاتی۔ آپ کی زندگی میں یہ روز کا تجربہ ہے کہ آپ بہت سے مباح اور جائز اور بہ ظاہر غلط نہ لگنے والے کام بھی جو تنہائی میں کر لیتے ہیں، اگر کوئی سامنے موجود ہو تو وہی کام نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر، آپ تنہائی میں جماہی لے لیتے ہیں، مگر کسی کے سامنے جماہی کو روک لیتے ہیں۔ ایسے ہی اگر گھر میں ہیں تو بغیر استری کے کپڑے بھی پہن لیے تو کوئی حرج نہیں یا کہیں جانا نہیں تو رات کے کپڑوں میں چھٹی کا دن گزار دیا۔ لیکن اگر کسی مہمان کی آمد کا پتا چل جائے، خواہ

وہ کتنا ہی بے تکلف اور قریبی ہو، آپ کا دھیان فوراً اپنے کپڑوں کی طرف جاتا ہوگا۔

ایسا ہی ہے ناں؟ اگر آپ بے حس نہیں، آپ باشعور اور غور وفکر کرنے والے دماغ رکھتے ہیں تو آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایسا ہی ہے!

''احسان کیا ہے؟'' شارحین حدیث نے اس حدیث کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ جیسے ایک محب یہ چاہتا ہے کہ اس کا محبوب ہر وقت اُس کی نظروں کے سامنے رہے، ایسے ہی جب کسی انسان کا محبوب اس کا خالق اللہ بن جاتا ہے تو وہ انسان یہ چاہتا ہے کہ اللہ جسے وہ بہت زیادہ چاہتا ہے، اس کے سامنے رہے۔ یہ تو اس احسان اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ لیکن، اس سطح پر اپنے یقین اور ایمان کو لے جانے والے بہت کم ہیں۔ لہٰذا، اگلے مرحلے پر یہ بھی فرمادیا گیا کہ یہ تو یقین رکھو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ احسان کے اعلیٰ ترین سے درجے سے کم تر درجہ ہے۔ تاہم، یہ کیفیت بھی کم ہی بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کیفیت میں بھی ہم آجائیں تو ہم کسی حد تک احسان کے درجے پر فائز ہوسکتے ہیں۔

لیکن، آج ہمارا حال یہ ہے کہ اِدھر ہم نماز کیلئے نیت باندھتے ہیں تو اُدھر وہ تمام بھولے بسرے کام یاد آنا شروع ہوجاتے ہیں جو دن بھر یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آرہے تھے۔ ایسی نمازوں کے بارے میں آں حضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی یاد آجاتا ہے کہ روزِ قیامت حساب کے دوران ایسی نمازیں پرانے کپڑے کی طرح نماز پڑھنے والے کے منھ پر ماردی جائیں گی، یعنی قبول ہی نہیں ہوں گی۔ (اگرچہ یہاں علما وفقہا نے یہ بحث کی ہے کہ آدمی اس بنا پر نماز پڑھنا نہ چھوڑے، کیوں کہ بعض اوقات یہی بات یاد دلا کر شیطان ہمیں ہماری ٹوٹی پھوٹی نمازوں سے بھی دور کردیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہمیں جیسی بھی نماز پڑھنے کی توفیق دی ہے تو وہی تو اسے قبول کرنے والا ہے۔ بھلا، ہم انسانوں میں کیا یہ طاقت ہے کہ اللہ کی شان کے مطابق اس کی عبادت کرسکیں؟)

بہ ہرکیف، صحابہ کرام اس درجے پر فائز تھے کہ اُن کی نمازیں ایسی تھیں کہ وہ اپنی عبادت کے دوران اللہ کو دیکھنے کی کیفیت میں ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کا مفہوم ہے کہ میں نے کوئی نماز اللہ کو دیکھے بغیر نہیں پڑھی۔ میں بن دیکھے اللہ کی عبادت نہیں کرتا۔ یہ کیفیت حقیقت میں نفس مطمئنہ کی کیفیت ہے جس میں رہتے ہوئے اللہ بہت اچھی طرح دکھائی دیتا ہے، بلکہ ہر وقت اُن کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے... بالکل محبوب کی مانند اُن کے سامنے رہتا ہے۔

تاہم، یہاں ایک نکتہ جو آج اکیسویں صدی کے مسلمانوں کیلئے بہت اہم ہے... جب حدیث جبریل کے حوالے سے یہی بات مسلمان بھائیوں سے کی جاتی ہے تو وہ یہ اِشکال کرتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکیں۔ یاد رکھیے، حدیثِ جبریلؑ میں الفاظ یہ نہیں کہ ''احسان یہ ہے کہ گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو'' بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت (أَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ) اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو''... اس سے پتا چلا کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ذکر احسان کے ساتھ ہورہا ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا۔ اسی لیے اسی جملے کے اگلے حصے میں آں حضرت ﷺ نے فوری یہ وضاحت بھی فرمادی کہ فَإِنَّکَ إِنْ لَا تَرَاہُ فَإِنَّہُ یَرَاکَ کہ یہ تو ممکن نہیں کہ تم اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکو، مگر وہ اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

احسان کی شرط کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ انسان اسی درجے کا لائف اسٹائل اختیار کرکے ہی نفس مطمئنہ پاسکتا ہے۔ چنانچہ نفس مطمئنہ میں رہنے والے لوگ اللہ کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ان کے قالب اور روح لطیف ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں پر دنیا کے گناہوں کی کثافت نہیں ہوتی۔ اس مقام پر سب سے پہلے رسول اور انبیا ہیں، پھر شہدا، صدیقین، صالحین ہیں۔

ہم کہاں ہیں؟

ہم اب تک تینوں نفسوں اوران کی خصوصیات پر بات کر چکے ہیں۔ ہمیں یہ بھی پتا چل گیا کہ کون لوگ نفس امارہ میں رہتے ہوئے اپنی زندگی گزارتے ہیں تو کون ہیں جو نفس مطمئنہ میں رہتے ہیں۔ اب ہماری باری ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے بیشتر اوقات میں کس کیفیت میں رہتے ہیں... نفس امارہ میں؟ نفس لوامہ میں؟ یا نفس مطمئنہ میں؟

البتہ ہمارے لیے بہت بڑی خوش خبری یہ ہے کہ ہمارا امتحان ابھی جاری ہے۔ ہمیں ابھی نہیں بتایا گیا کہ ہم زندگی کے امتحان میں ناکام ہیں یا کامیاب۔ کوئی ایسا قانون نہیں کہ جس کے تحت امتحان ابھی جاری ہو اور اس کے نتیجے کا اعلان کردیا جائے۔ فرض کیجیے، آپ امتحان گاہ (Examination Hall) میں بیٹھے ہوئے پرچہ حل کر رہے ہیں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے ہی میں ممتحن (Examiner) آپ سے آپ کا پرچہ لے کر آپ سے کہے کہ آپ فیل ہوجائیں گے... تو کیا آپ یہ مان لیں گے؟ قطعاً نہیں۔ آپ فوراً احتجاج کریں گے کہ ابھی تو میرا وقت باقی ہے، مجھے اور پرچہ حل کرنا ہے۔ اگر دنیا میں کہیں ایسا ہوا تو یہ انتہائی ناانصافی ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والا ہے۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان نے کوئی بھی گناہ، حتیٰ کہ شرک اور کفر بھی کیا، اگر وہ اللہ کے دربار میں توبہ کر کے واپس آئے گا تو وہ اسے خوش آمدید کہے گا اور اس کے گناہ معاف کردے گا۔ حدیث قدسی میں ہے:

يَا عِبَادِيْ! اِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، فَاسْتَغْفِرُوْنِيْ اَغْفِرْ لَكُمْ

ترجمہ: ''اے میرے بندو! تم دن رات خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو

معاف کرنے والا ہوں۔ پس تم مجھ سے مغفرت چاہو، میں تمہیں (یعنی تمہارے سارے گناہوں کو) معاف کردوں گا۔'' (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

اس کا مطلب ہماری بحث کی روشنی میں ہوا کہ خواہ میں پوری زندگی نفس امارہ میں بسر کرتا رہا ہوں، یا نفس لوامہ میں ہچکولے کھاتا رہا ہوں، لیکن جب مجھے یہ شعور آیا تو زندگی کے آخری سانس تک اگر اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کیلئے میں نفس مطمئنہ پر آگیا تو اللہ میرے پچھلے تمام گناہ معاف کردے گا اور مجھے میرے امتحان میں پاس کردے گا۔ سبحان اللہ!

ایک اہم سوال

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چلئے، میں نفس امارہ یا نفس لوامہ کی زندگی چھوڑ کر نفس مطمئنہ میں رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہوں... تو کیسے گزاروں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس نفس مطمئنہ کے چند ماڈل بھیج دیے ہیں تاکہ یہ اعتراض بھی نہ رہے کہ میں تو اللہ کے قریب آنا چاہتا تھا، لیکن مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کیسے؟ لہٰذا، ان بندوں کے ذریعے ہمیں یہ بھی دکھادیا گیا کہ ہم اگر چاہیں تو کہ نفس مطمئنہ والی زندگی بسر کریں تو اپنے جسم میں رہتے ہوئے، اپنی جسمانی اور خاکی ضروریات پوری کرتے ہوئے کیوں کر اپنی زندگی کو کامیاب کرسکتے ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ہم نفس امارہ پر ہوں، نفس لوامہ پر ہوں یا نفس مطمئنہ پر... ہر حال میں ہمیں اپنی زندگی میں اپنی جسمانی ضروریات... غذا، جنس، نیند... تو پوری کرنی ہی ہیں۔ اصل امتحان تو یہی ہے کہ ہمیں اپنی یہ ضروریات پوری کرنے کیلئے کس کیفیت کا انتخاب کرنا ہے۔

اصل امتحان ہی یہ ہے کہ آدمی اس خاکی دنیا میں رہتے ہوئے، خاکی وجود کی ضروریات پوری کرتے ہوئے کہ جو بہت نمایاں ہیں، روحانی وجود کی ضروریات بھی پورا کرے۔ وہ خاکی ضروریات میں اتنا محو نہ ہو جائے کہ روحانی ضروریات کو چھوڑ دے۔

روح کی ضروریات

اس لیے جیسے ہم اپنے خاکی وجود کی تین بنیادی ضروریات کیلئے فکرمند رہتے ہیں اور عمل کرتے ہیں، ایسے ہی ہمیں روحانی وجود کی ضروریات بھی پوری کرنی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا ہے کہ انسانی روح کی غذا کیا ہے؟

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ()

ترجمہ: یادرکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ (سورۃ الرعد، 28)

ذکر کیا ہے؟

آں حضرت ﷺ سے ارشاد فرمایا گیا:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ()

وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ()

ترجمہ: لہٰذا، جب تم فارغ ہو جاؤ تو (عبادت میں) اپنے آپ کو تھکاؤ۔ اور، اپنے پروردگار ہی سے دل لگاؤ۔ (سورۃ الانشراح، 7،8)

آں حضرت ﷺ نبوت ملنے سے پہلے سے غارِ حرا میں جا کر ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر نبوت سے سرفراز ہوئے تو کیا یہ دعوت الی اللہ، نماز، تلاوت قرآن وغیرہ اللہ کیلئے

نہیں تھا؟ لیکن، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرما رہے ہیں کہ جب وہ فارغ ہوا کریں تو والی ربك فارغب... اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ ہے۔ دیگر نیک اعمال بھی... اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کیے جا رہے ہیں... اگرچہ عبادت ہیں... لیکن یہ اعمال بالواسطہ ذکر ہیں۔ جبکہ اس آیت میں اشارہ اس جانب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف خاص توجہ مطلوب ہے جو خالص لوجہ اللہ ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ پر خاص کیفیت طاری تھی۔ میں نے بات کرنا چاہی تو آں حضرت ﷺ نے فرمایا، من انت۔ میں نے عرض کیا، عائشہؓ۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا، کون عائشہؓ؟ عائشہ نے دوبارہ عرض کیا، ابوبکر کی بیٹی عائشہ۔ پھر آں حضرت ﷺ نے فرمایا: من ابوبکر، یعنی ابوبکر کون؟ بعد میں حضرت عائشہ نے آں حضرت ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

انی مع اللہ وقت کہ اُس وقت میں میرے ساتھ اللہ تھا اور اللہ کے ساتھ میرا ایک خاص وقت ہے، جس میں کسی دوسرے کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر کی تسبیحات صبح شام پڑھ لیں تو اللہ کا ذکر ہو گیا۔ قرآن کی تلاوت کر لی تو ذکر اللہ کی ذمے داری پوری کر لی۔ کیا یہی ذکر اللہ ہے؟ کیا خاص وقت میں، خاص مقام پر بیٹھ کر خاص اوراد و وظائف کے پڑھ لینے کا نام ذکر ہے؟

تو پھر، ذکر کا حقیقی معیار کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے ہاں، سب سے بلند ترین مقام پر انبیا فائز ہیں۔ ان انبیا میں حضرت ابراہیم برگزیدہ ترین انبیا میں سے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری قوم حتیٰ کہ آپ کے والد تک بت پرستی میں ملوث تھے، لیکن آپ بت پرستی سے بیزار

تھے اور دوسروں کو بھی علی الاعلان اس گندگی سے باز رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ چوں کہ بادشاہِ وقت بھی قوم کے ساتھ تھا اس لیے رفتہ رفتہ حضرت ابراہیم کا خاندان، قوم اور بادشاہ سبھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن پیغمبر اولو العزم ابراہیم علیہ السلام کے عزم اور مقصد میں کوئی لغزش نہیں آئی بلکہ شرک وکفر سے بیزاری میں مزید سختی آ گئی۔ آخر ایک دن اپنی قوم کے بت کدے میں جا کر تمام بت توڑ ڈالے جس پر تمام دشمن غیظ وغضب کی آگ میں بھڑک اٹھے اور فیصلہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جائے۔

چناں چہ آگ بھڑکا کر ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا۔ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت بھی اللہ کی رضا کو فوقیت دی اور اتنے سخت حالات میں بھی قوم اور بادشاہ سے سمجھوتا نہیں کیا۔ قوم سے مدد مانگنا تو درکنار جب حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکا جا رہا تھا تو اُس وقت جبریل امین حاضر ہوئے اور انھوں نے حضرت ابراہیم کو مدد کی پیشکش کی۔ حضرت ابراہیم نے اس پر بے دھڑک فرما دیا کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ (تفسیر ابن جریر طبری، سورۃ الانبیا، آیت 66 تا 68)

تب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم بہ راہِ راست آگ کو جاری ہوا:

قُلْنَا یَا نَارُ کُونِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰٓی اِبْرَاہِیْمَ

ترجمہ: ہم نے کہا: ''اے آگ! ٹھنڈی ہو جا، اور ابراہیم کیلئے سلامتی بن جا۔''

(سورۃ الانبیا، 69)

چنانچہ حکم خداوندی سے وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے ٹھنڈی ہو گئی اور آپ اس آزمائش میں کامیاب ہوئے۔

کیا آپ نے اس پہلو پر غور کیا کہ اس کی نوبت کیوں آئی؟ اگر اللہ تعالیٰ کو چند اذکار ہی مطلوب ہوتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اللہ کا نام خوب لیتے تھے، بہت زیادہ اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ تو اللہ کے نبی تھے۔ لیکن، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے

انھیں حکم فرمایا کہ آپ جا کر بتوں کو توڑیے۔ آپ نمرود کے دربار میں جا کر توحید کی دعوت دیجیے۔ آپ کو آگ میں کودنا ہے۔ اپنے بیٹے کو ذبح کیجیے تا کہ پتا چلے کہ یہ بیٹا میرے لیے مانگا ہے یا اپنے لیے مانگا ہے۔ پھر کہا گیا کہ اپنے بیٹے اور بیوی کو ویران صحرا میں چھوڑ کر چلے جائیے۔ بیابان میں اللہ کا گھر کی تعمیر کیجیے۔ گھر کی تعمیر کے بعد آواز لگائیے اور میری طرف بلائیے۔

کیوں کہ حضرت ابرہیم علیہ السلام ہر آزمائش پر پورے اترے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ''خلیل اللہ'' (یعنی اللہ کا دوست) کے مقام سے سرفراز فرمایا۔

یہ ایک مثال ہے۔ ایسی مثالوں سے قرآن اور پھر تاریخ بھری پڑی ہے کہ اللہ کے جن بندوں نے نفس مطمئنہ کے مطابق زندگی گزاری اور انھوں نے اطمینانِ قلب کیلئے ''ذکر اللہ کی شرط'' پوری کی، انھوں نے ایسے ہی زندگی گزاری۔ محض کسی کونے میں بیٹھ کر وظائف واوراد میں مشغول نہ رہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ''ذکر اللہ'' دراصل عمل کا نام ہے... وہ عمل جو عین اللہ کے حکم اور خواہش کے مطابق ہو۔

عمل... خاص اللہ کے احکام کے مطابق کیا جائے گا تو ہی روح کی ضروریات پوری ہوں گی اور اس کی نشوونما ہوگی۔ اس لیے، یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لیجیے کہ

ذکر کا مطلب... طرزِ زندگی ہے!

آپ کا لائف اسٹائل کیا ہے؟ آپ خود جانتے ہیں۔ لیکن، اگر دلوں کا اطمینان چاہتے ہیں تو وہ طرزِ حیات اختیار کرنا ہوگا جو خاتم الانبیا آں حضرت ﷺ نے ہمیں بتایا۔ کیوں کہ ہر دَور میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی نیک بندہ (رسول یا نبی) بہ طور ماڈل بھیجا، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے اس امت کیلئے قیامت تک کے واسطے آں حضرت ﷺ کو ماڈل بنا کر بھیجا ہے ... جسے قرآن نے ''اسوۂ حسنہ'' کا نام دیا۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

(سورۃ الاحزاب،21)

آپ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آں حضرت ﷺ تک تمام نبیوں کی زندگی کا مطالعہ کر لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی زندگیاں آزمائشوں سے بھری پڑی ہیں۔ ایک کے بعد ایک سختی اور مشقت۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اول تو انھیں جانچنا چاہتے تھے اور دوسرے، دیگر عام انسانوں کیلئے وہ ذریعہ رہ نمائی بن سکیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ سے سوال کیا کہ سب سے زیادہ آزمائش کس پر آتی ہے؟ تو آں حضرت ﷺ نے فرمایا، ''انبیا پر، اس کے بعد ان جیسے لوگوں پر، اور ان کے بعد ان جیسوں پر۔''

حتیٰ کہ خاتم الانبیا حضرت محمد ﷺ کا خود ارشادِ گرامی کا مفہوم ہے کہ مجھ پر جو آزمائشیں آئیں، وہ گزشتہ تمام انبیا کی آزمائشوں سے زیادہ ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو آں حضرت ﷺ کا درجہ سب انسانوں سے بلند کیا:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

ترجمہ: اور، ہم نے تمہاری خاطر تمہارے تذکرے کو اونچا مقام عطا کر دیا ہے۔

(سورہ انشراح،4)

اور اس سے بڑھ کر آں حضرت ﷺ کیلئے اعزاز کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ

ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔

اس لیے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ()

ترجمہ: اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو، اور خوب سلام بھیجا کرو۔

(سورہ احزاب،56)

لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر آں حضرت ﷺ نے اپنی تریسٹھ سالہ زندگی میں جو تکالیف اور مصیبتیں جھیلیں، وہ تمام انسانوں کی تکالیف سے زیادہ ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کا اعتراف کیا کہ ہم نے آپ ﷺ کی صورت میں انسانِ کامل بھیجا جس نے اس دین کو آخرت تک آنے والے انسانوں کیلئے اسے کامل (مکمل) کر دیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ (سورہ مائدہ،3)

نیز، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ شرط عائد کر دی کہ جو میرا قرب چاہتا ہے، وہ آں حضرت ﷺ کا قرب حاصل کر لے۔ جو میرا بننا چاہتا ہے، وہ میرے محبوب ﷺ کو اپنا محبوب بنا لے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ()

ترجمہ: (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

(سورہ آل عمران،31)

آں حضرت ﷺ کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے کہ کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے بڑھ کر مجھ سے محبت نہ کرے۔'' (بخاری، مسلم)

چنانچہ صحابہ کرام کا معاملہ یہ تھا کہ وہ آں حضرت ﷺ کے ارشاد پر اپنی ہر ہر شے حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار تھے۔ ایسے بہت سے واقعات ہمیں سیرت کتب میں ملتے ہیں۔ وہاں پڑھے جاسکتے ہیں۔

کلمہ لا الہ الا اللہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوگا، جب تک اس کے ساتھ محمد رسول اللہ نہیں ہوگا۔ آں حضرت ﷺ کو اتنا بڑا مقام حاصل تھا، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے زندگی میں بے انتہا مشققتیں جھیلیں۔ صرف یہی نہیں، کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا تھا کہ آں حضرت ﷺ کا دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہٹے۔ بلکہ جب نماز کا وقت ہوتا تو امہات المومنین فرماتی ہیں کہ آں حضرت ﷺ ایسے ہوجاتے، گویا ہمیں جانتے ہی نہیں۔ حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ آں حضرت ﷺ کی نماز کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آں حضرت ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور رونے کی وجہ سے آپ کے سینے سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسی ہنڈیا میں ابلتے ہوئے پانی کی آواز ہوتی ہے۔ (سنن ابی داؤد، 904)

آں حضرت ﷺ کی زندگی اتنی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے محفوظ کردیا ہے تاکہ جو عمل کرنا چاہتے اور میرا بننا چاہے، اس کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے۔ آں حضرت ﷺ انسانی تاریخ میں وہ واحد شخصیت ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور ہر ہر گھڑی تاریخ آج بھی محفوظ ہے۔ ایسی مثال دنیا کی کسی دوسری شخصیت کے بارے میں نہیں ملتی۔ اگر ایک جانب اللہ تعالیٰ نے آں حضرت ﷺ کو perfect model بنایا تو اس پر ماڈل سے فیض یاب ہونے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس ماڈل کی حفاظت بھی کی ہے۔

ہمارا دھوکا

دوسری جانب ہمارا کیا حال ہے؟ ہم خود اپنے بارے میں خوب جانتے ہیں۔ چلئے، یہاں تک درست ہے، لیکن معاملہ یہ ہے کہ ہم اس دھوکے میں ہیں فلاں سے رشتے داری ہماری نجات کیلئے کافی ہے، فلاں سرداری ہمیں قیامت کے دن بچالے گی یا فلاں سلسلہ ہمیں بے حساب کتاب جنت میں لے جانے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یوں، یہودیوں کی طرح ہم مسلمان بھی نہ اللہ کے احکام کی پرواکرتے ہیں اور نہ رسول کی سنت اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ آں حضرت ﷺ نے اپنی سب سے پیاری بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے فاطمہ، تمہیں یہ بات دھوکے میں نہ ڈال دے کہ تم نبیؐ کی بیٹی ہو تو بخشی بخشائی جنت میں چلی جاؤ گی۔

حضرت فاطمہ جو آں حضرت ﷺ کی سب سے چہیتی بیٹی ہیں اور جنت کی عورتوں کی سردار ہوں گی، انھیں آں حضرت ﷺ یہ تنبیہ فرمارہے ہیں کہ محض رشتے داری کے بھروسے پر اپنے عمل سے بے پروا نہ ہوجانا۔ جب معاملہ اتنا حساس ہے تو کوئی کتنا ہی بڑا پیر و مرشد ہو، کتنا ہی بڑا آپ کا سلسلہ خلافت ہو، آپ کیسے یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ میں اپنے پیر صاحب کے صدقے جنت میں چلا جاؤں گا... نعوذ باللہ!

اگر کوئی یہ سمجھ رہا ہے تو کیا وہ بہ الفاظِ دیگر کیا یہ دعویٰ نہیں کررہا ہے کہ نعوذ باللہ، میری نسبت میرے شیخ یا پیر سے زیادہ ہے بہ نسبت آں حضرت ﷺ کی حضرت فاطمہ سے جو نسبت تھی۔ یہ بات اگرچہ زبان سے تو نہیں کہی جارہی، لیکن عملی طور پر اس کا اظہار ہورہا ہے اور ہمارے معاشرے میں یہ چلن بہت عام ہے۔ غور کیجیے کہ کائنات کی عظیم ترین اور خالق کائنات کی محبوب ترین ہستی سرکارِ دو عالم ﷺ اپنی بیٹی سے یہ کہہ رہے ہیں کہ قیامت میں بخشش کیلئے محض میری رشتے داری پر اکتفا نہ کر بیٹھنا۔ یوں، ہم بے عملی کی انتہاؤں میں

گر چکے ہیں۔ یہ بہت بڑا دھوکا ہے جس میں ہم من حیث المجموع گرفتار ہیں۔

سواری یا منزل

دوسرا دھوکا ہمیں یہ ہو گیا کہ ہم سواری کو منزل سمجھنے لگے۔ مثال کے طور پر، آج بڑی تعداد میں لوگ مراقبہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے روحانیت حاصل ہو گی۔ Spritualism کے نام سے بڑے بڑے ادارے ہیں جو مراقبہ یہ کہہ کر کراتے ہیں کہ اس سے اُن کی روح کو جلا (Spiritual Enlightenment) ملے گی۔ جو لوگ برسوں سے مراقبہ کر رہے ہیں یا مبتدی ہیں، میں ان سے سوال کیا کرتا ہوں کہ آپ مراقبہ کیوں کر رہے ہیں؟ اکثر تو انھیں اس سوال کا جواب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر جواب ملتا بھی ہے تو غلط۔

روحانی جلا کیلئے مراقبہ کرنے والوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ سواری پر سوار تو ہو گئے ہیں، لیکن انھیں منزل کا پتا ہی نہیں کہ 'مراقبے کی سواری' کے ذریعے انھیں جانا کہاں ہے... یا جس منزل کو وہ منزل سمجھ رہے ہیں، وہ درست یا حقیقی منزل ہے ہی نہیں۔

خدا نہ خواستہ کہیں دھماکا ہو جائے تو مجمع بے ہنگم اِدھر سے اُدھر بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ کسی کو کچھ نہیں پتا ہوتا کہ وہ کس سمت میں جا رہا ہے۔ بس، اس کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ یہاں سے نکلو تا کہ جان بچ سکے۔ آج روحانیت کے نام پر بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ لوگ مختلف طریقے اختیار کر کے... روحانیت کے نام پر، مائنڈ سائنس کے نام پر، مذہب کے نام پر... یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ بہت کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن، انھیں یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، کیسے پتا چلے گا کہ وہاں پہنچ گئے ہیں، کیا حاصل ہو گا؟ ایسے کئی سوالات ہیں جن کے جوابات انھیں معلوم ہی نہیں ہیں۔

یہ تمام وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی نام نہاد روحانیت کو جلا بخشنے کیلئے مختلف بے بنیاد

اور غیر شرعی طریقے خود ہی ایجاد کر لیے۔ اس پر مستزاد، لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں دنیاوی زندگی میں جو چاہے، کروں... اور یوں ہی عمل کرتے کرتے، نفس مطمئنہ حاصل کر کے روحانی ترقی پا لوں گا۔ یہ شیطانی دھوکا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس دھوکے میں وہ لوگ زیادہ مبتلا ہوتے ہیں جو نفس امارہ کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے روحانی معراج اور روحانی نمو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے پیچھے کارفرما قوت اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلو تہی برتنا ہے۔ یہ پہلو تہی دراصل کفر ہے۔ کفر کا لغوی معنی ہے، انکار۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرتے ہیں... جانے اَن جانے... وہ درحقیقت کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ بہ بانگ دہل یہ جرات کر جاتے ہیں تو بعض ڈھکے چھپے ایسا کرتے ہیں۔

آج بعض سادہ لوح مسلمان بھی ان جھانسوں میں آ جاتے ہیں اور ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو کفر کے مترادف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو یہ تنبیہ دے دی ہے کہ اللہ کی آیتوں اور احکام کا انکار کرنے والے کبھی تمہارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے اور نہ وہ آپ کی مدد کریں گے، بلکہ اللہ ہی آپ کی بھلائی چاہتا ہے اور وہی آپ کی بہترین مدد کرنے والا ہے۔

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ () بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ()

ترجمہ: اے ایمان والو! جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے اگر تم ان کی بات مانو گے تو وہ تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا دیں گے، اور تم پلٹ کر سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ (یہ لوگ تمہارے خیر خواہ نہیں) بلکہ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے، اور وہ بہترین مددگار ہے۔

(سورہ آلِ عمران، 149، 150)

گویا، ہمیں کفر کی جانب سے جتنے بھی دل کش معیارات اور ٹھوس حقائق

دکھائی دیتے ہیں، وہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ لہٰذا، خدائی قانون اور ضابطے کے تحت ایسا ممکن نہیں ہے کہ آدمی چلے تو نفس امارہ کے راستے پر اور پا جائے روحانی سکون۔ اللہ تعالیٰ نے جو اس پوری کائنات کا خالق ہے، انسان کو پیدا کرنے والا ہے، اسی نے یہ ضابطہ دیا ہے کہ اگر انسان کو نفس مطمئنہ والی کیفیت پر آنا اور اپنے روحانی وجود کو جلا بخشنی ہے تو اسے اپنی زندگی میں جس سسٹم پر چلنا ہوگا، وہ صرف اور صرف ''محمد رسول اللہ'' ہے۔ یعنی آں حضرت ﷺ نے جس انداز سے اپنی زندگی گزاری اور جس انداز سے روزمرہ کام انجام دیے، انھی طریقوں کو اختیار کر کے آدمی نفس مطمئن پا سکتا ہے۔

آپ ہواؤں میں اُڑنا شروع کر دیں، آپ کو پہلے سے خواب دکھائی دینے لگیں، آپ کی تیسری آنکھ کھل جائے یا چھٹی حس بیدار ہو جائے، لوگوں کے عیب آپ پر نمودار ہو جائیں... کچھ بھی ہو جائے... اگر آپ کا طریقہ آں حضرت ﷺ کے طریقے سے مماثلت نہیں رکھتا تو یہ سب بے کار ہے۔ میں پورے وثوق سے یہ بات لکھ رہا ہوں کہ ایسا فرد تاریکی میں سفر کر رہا ہے اور بہت جلد تباہی سے جا ٹکرائے گا۔

اس میں اگرچہ کوئی شک نہیں کہ انسانی تاریخ میں بعض انتہائی ذہین لوگ محض اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے بہ ظاہر حقیقت کے قریب ترین پہنچے ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ... ہم نے بنی آدم، انسان پر کرم کیا۔ یہاں آدم یعنی انسان پر اللہ تعالیٰ اپنے کرم کی بات کر رہا ہے۔ فقط مسلمان پر 'کرم' کی بات نہیں ہے۔ لیکن، ان سب دانش وروں کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوا کہ ان کی سوچ صرف خاکی وجود اور اُس کے تقاضوں تک رہی۔ لہٰذا، ان لوگوں نے روح کا انکار کر دیا۔ انکار سے مراد لفظی انکار ضروری نہیں، بلکہ معنوی انکار ہے۔ انھیں یہ ادراک ہی نہیں تھا کہ روح بھی کوئی شے ہے۔ اس لیے کہ روح کا تعلق براہِ راست علم وحی سے ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار کرتے ہیں، وہ روح اور روحانیت کو سمجھ ہی نہیں

سکتے۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ وہ تمام لوگ اور ماہرین جو Spiritulism کی بات کرتے ہیں اور اس کی قوت کیلئے مختلف قسم کے حربے اختیار کرتے اور دوسروں کو سکھاتے ہیں، وہ روح اور روحانیت کا عشرِ عشیر بھی نہیں جانتے۔ بلکہ جاننا تو اگلا مرحلہ ہے، ان لوگوں کو اس کا شعور بھی نہیں ہے۔ دراصل، یہ لوگ جس چیز کو اپنے حواسِ خمسہ سے ناپ تول نہیں پاتے، اسے عرفِ عام میں روحانیت کی طرف ہنکا دیتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی دنیا میں، اکثر کی زندگی میں، ان کے مخالفین پیدا ہو گئے بلکہ ان کے اپنے شاگردوں نے ان کی تحقیقات اور نظریات سے اختلاف کیا۔

میرا رجوع اور ایک اہم نکتہ اصلاح

ایک زمانہ تھا کہ میں کہا کرتا تھا کہ میں نے عقل کی بنیاد پر اسلام قبول کیا ہے، یعنی میں اگرچہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا ہوں، لیکن محض اپنے رواجی اور روایتی اسلام پر عمل نہیں کرتا بلکہ اسلامی اور شرعی احکام کو میں نے اپنی عقلی اور سائنسی بنیادوں پر سمجھ کر اسلام کی حقانیت کو تسلیم کیا ہے۔ ہم اکثر یہ سنتے رہتے ہیں کہ جناب، اُن غیر مسلموں میں تو تمام خوبیاں ہیں، بس ایک اسلام لے آئیں تو وہ ہم سے اچھے مسلمان ہیں۔ یہ جملہ بہت عام ہے۔ ہم اکثر یہ بات سنتے ہیں۔

لیکن اللہ کی توفیق سے مجھے یہ نکتہ سمجھ آیا کہ ایمان کی عطا تو رسول کی دعا پر بھی نہیں ہوتی۔ محض تحقیق کر کے کوئی کتنے ہی سائنسی اور قرآنی حقائق جان جائے، وہ ایمان نہیں لا سکتا جب تک اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا اپنے بیٹے کے حق میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اپنے باپ کے حق میں قبول نہیں ہوئی۔

قرآن پاک میں آں حضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

ترجمہ: (اے پیغمبر!) حقیقت یہ ہے کہ تم جس کو خود چاہو، ہدایت تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور ہدایت قبول کرنے والوں کو وہی خوب جانتا ہے۔ (سورۃ القصص،56)

اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتا دیا کہ ہدایت قبول کرنے کی توفیق ملنا، صرف اللہ کے اختیار میں ہے، آں حضرت ﷺ کو بھی یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

ترجمہ: (اے پیغمبر!) ان (کافروں) کو راہِ راست پر لے آنا آپ کی ذمے داری نہیں ہے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، راہِ راست (ہدایت) پر لے آتا ہے۔

(سورۃ البقرہ،272)

تمام پرچوں میں کامیابی ضروری ہے

یہاں برسبیل تذکرہ، اس معروف نکتہ اعتراض کی وضاحت بھی کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو ہمارے ہاں کے اکثر مغرب زدہ مسلمان کیا کرتے ہیں کہ ''انھیں (یورپ اور امریکا والوں کو) دیکھو، کتنے با اخلاق اور منظم و مرتب ہیں۔ وہ تو دنیا ہی میں جنتی ہیں۔ ہم نے یوں ہی ان پر کافر کا لیبل لگا کر انھیں اپنے سے الگ کر دیا ہے۔''

یہاں میں قرآن کریم کی سورۃ العصر کا حوالہ دیتے ہوئے یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جیسے کسی کلاس میں کئی پرچے ہوتے ہیں اور اگلی جماعت میں جانے کیلئے تمام پرچوں میں پاس ہونا ضروری ہے، ایسے ہی اسلام کا معاملہ ہے۔ سورۂ عصر میں یہ نکتہ واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ اسلام اور ایمان کے پرچے کون کون سے ہیں۔

وَالْعَصْرِ () اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ()

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ()

ترجمہ: زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں، اور نیک عمل کریں، اور ایک دوسرے کو حق کی بات کی نصیحت کریں، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں۔

(سورۃ العصر،1 تا3)

سورۂ عصر کو علمانے مکمل دین کی تشریح قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ''اگر لوگ صرف اسی سورت پر غور وفکر کریں تو انھیں کافی ہوگی۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی کوئی دوسری سورہ نازل نہ ہوتی، صرف سورۃ العصر نازل کر دی جاتی تو ایمان والوں کیلئے اس میں اتنی جامع رہنمائی موجود ہے جو کی زندگی میں عمل کیلئے کافی ہوتی۔

آپ سورہ عصر پر غور کیجیے تو آپ کو پتا چلے گا کہ روحانیت کے اس امتحان میں کامیابی کیلئے چار پرچوں (پیپر) کا امتحان دینے کی بات کی گئی ہے:

اول	امنوا	ایمان
دوم	عملوا الصالحات	اچھے اخلاق اور نیک اعمال
سوم	تواصوا بالحق	حق کی ترغیب
چہارم	تواصوا بالصبر	صبر کی تلقین

ایسے میں اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے اچھے کام بھی دنیا میں کیے ہیں، حق بات بھی کی ہے، اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزاری ہے ... لیکن ایمان نہیں لایا تو وہ کامیاب لوگوں میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے ایک طالب علم اپنی کلاس کے سات مضامین میں سے چھے میں بہت اچھے نمبر لے آئے، مگر ایک مضمون کے پرچے میں فیل ہو جائے تو اسے اگلے درجے میں داخلہ نہیں دیا جائے گا، جب تک وہ ساتوں مضامین کا امتحان پاس نہ کر لے۔ وہ ساتوں پرچوں میں خواہ اوسط نمبر ہی لے کر آئے، مگر پاسنگ مارکس ہی لے آئے، وہ

کامیاب قرار دیا جائے گا اور اسے اگلے درجے میں داخلے کا اہل قرار دیا جائے گا۔

ایسے ہی جو اہل مغرب، کتنے ہی دیانت دار ہوں، کتنے ہی اَخلاق والی زندگی گزارتے ہوں، سچے ہوں، ہر قسم کے حالات میں صبر وشکر ادا کرنے والے ہوں... لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اگر وہ پہلے پرچے (آمنوا) میں ناکام رہے تو انھیں آخرت کے پرچے میں ناکام ہی قرار دیا جائے گا، وہ جنت کے حق دار نہیں ہوسکتے۔ اس کے برخلاف، ایک آدمی خواہ وہ بہت زیادہ حق بات کہنے والا نہ ہو، صبر وشکر بھی اتنا نہ کرتا ہو، بہت مثالی کردار بھی نہ رکھتا ہو، مگر ایمان والا ہے تو اس پر غور کیا جاسکتا ہے کہ اسے جنت میں بھیج دیا جائے۔

لہٰذا، یہ نکتہ یاد رکھیے کہ آخرت کی کامیابی ایک پرچے یا دو پرچوں میں پاس ہونے پر نہیں، تمام پرچوں میں پاس ہونے پر ممکن ہوگی اور ان پرچوں میں سب سے پہلا مضمون کا عنوان ''ایمان'' (آمنوا) ہے۔

نفس مطمئنہ کے مقام پر عقل مندی کافی نہیں

اس لیے، نفس مطمئنہ جو انسان کی کامیابی کا بلند ترین مقام اور حصولِ جنت کا حتمی وسیلہ ہے، اس تک پہنچنے کیلئے آدمی کو ایمان سے اپنے سفر کا آغاز کرنا ہوگا۔ ایمان کے بغیر، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں نفس مطمئنہ کے مقام پر عقل کی بنیاد پر جاسکتا ہوں یا چلا گیا ہوں... وہ بڑے دھوکے میں مبتلا ہے... وہ سب کچھ کرنے کے باوجود ابھی تک نفس امارہ کی سطح پر جی رہا ہے۔ اسے اپنی سوچ میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ جب سوچ درست ہوگی تو آدمی کو پتا چلے گا کہ وہ اگر اس مقام تک پہنچا ہے تو اِس میں تو اُس کا کوئی کمال نہیں ہے... یہ تو اللہ کی ''عطا'' ہے۔

یہ ''عطا'' کس کو ہوگی؟

یہ عطا اُس شخص کو ہوگی جو اپنی زمین کو تیار کرے گا۔ قانونِ قدرت ہے کہ جو زمین گداز اور نرم ہوگی، بارش برسے گی تو اسی زمین پر فصل ہوگی۔ بارش اگر سخت اور چٹیل زمین پر ہو تو وہاں بارش سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بارش برسانا اگرچہ خالق کائنات کا اختیار ہے، مگر بارش سے پہلے فصل کی پرداخت کیلئے اپنی زمین کو تیار کرنا، آدمی کا کام ہے۔

قلب کا مقام

اس کتاب کے آغاز میں ''میں کون ہوں؟'' کے عنوان سے جو خاکہ دیا گیا ہے، آپ کو اس میں ایک جگہ لفظ ''قلب'' بھی لکھا ہوا نظر آرہا ہے۔ اس ماڈل میں، یہ بحث قلب کے ذکر کے بغیر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ خاکی وجود اور روحانی وجود، نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی بحث کے بعد ہم اب کچھ بات قلب کی کر لیتے ہیں تاکہ ہمیں یہ پتا چل سکے کہ خود شناسی کے ضمن میں قلب کا کیا مقام ہے اور اس کا کردار کیا ہے۔

قلب دراصل مسلسل بدلنے والا ایک عضو ہے۔ قلب کی اس تبدیلی سے انقلاب آتا ہے۔ یہ جتنا بڑا انظام آپ کو اس خاکے میں دکھائی دے رہا ہے، اسے چلانے کیلئے ایک قلب کی ضرورت ہے۔ قلب نفس امارہ کے قریب ہوسکتا ہے تو نفس مطمئنہ کے قریب بھی ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کا قلب نفس امارہ کے قریب ہے تو یہ کثیف ہوگا اور جن لوگوں کا قلب نفس مطمئنہ کے قریب ہوتا ہے، ان کا قلب لطیف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، چونکہ گناہ گار کا قلب نفس امارہ کے قریب رہتا ہے، اس لیے وہ کثافت میں ہوتا ہے اور اللہ والوں کا قلب ذکر اللہ کی وجہ سے لطیف ہوتا ہے اور اسی وجہ سے یہ لوگ نفس مطمئنہ کے درجے کے قریب ہوتے ہیں۔

تعلیم اور تربیت

تعلیم کی تکمیل تبھی ہوسکتی ہے کہ جب آدمی کی تربیت بھی اس کے مطابق ہو۔بغیر تربیت کے تعلیم نقصان دہ ہوتی ہے، جیسے آج ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ اَن پڑھ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ کرپشن میں مبتلا ہیں، کیوں کہ ان کے پاس تعلیم تو ہے،مگر تربیت نہیں ہے۔ ہمارے پاس غالباً نظامِ تعلیم تو ہے، نظام تربیت مفقود ہے، ۔یہی وجہ ہے کہ ہر نیا قانون، قانون شکنی کے نئے راستے کھولتا ہے۔

جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ چونکہ وہ انسان کا خالق ہے، جانتا تھا کہ انسان کو تعلیم اور تربیت، دونوں کی ضرورت ہے، لہٰذا تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا، تربیت کا بھی اہتمام ہوا۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جس نظام کے تحت بنایا، اس میں دو قسم کی قوتیں موجود ہیں...ایک جو نفس امارہ کی طرف کھینچتی ہے تو دوسری نفس مطمئنہ کی طرف لے جانے والی ہے۔پہلی قوت شیطان کے ہاتھ میں ہے تو دوسری قوت سے استفادہ اللہ والے کرتے ہیں۔شیطان کے ہاتھ جو قوت موجود ہے، اسے استعمال کرنے والے شیطان کے پیروکار (حزب الشیطان) بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے نفس امارہ کی طرف متوجہ رہتے ہوئے عمل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی روحانی بالیدگی متاثر ہوتی ہے۔ جبکہ اللہ والوں کی جماعت (حزب اللہ) تمام زندگی دن رات نفس مطمئنہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

پہلی جماعت کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اِتَّخَذُوٓا اَيۡمَانَهُمۡ جُنَّةً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ۔ لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا ؕ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۔ يَوۡمَ يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا فَيَحۡلِفُوۡنَ لَهٗ كَمَا يَحۡلِفُوۡنَ لَكُمۡ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ۔

اِسۡتَحۡوَذَ عَلَيۡهِمُ الشَّيۡطٰنُ فَاَنۡسٰٮهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓـئِكَ حِزۡبُ الشَّيۡطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّيۡطٰنِ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ۔

ترجمہ: انھوں نے اپنی قسموں کو ایک ڈھال بنالیا ہے۔ پھر، وہ دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکتے رہے ہیں۔ اس لیے ان کیلئے ایسا عذاب ہے جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔ ان کے مال اور ان کی اولا اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ یہ دوزخ والے لوگ ہیں۔ یہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا تو اس کے سامنے بھی یہ اسی طرح قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے کھاتے ہیں، اور یہ سمجھیں گے کہ انھیں کوئی سہارا مل گیا ہے۔ یاد رکھو، یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان نے پوری طرح قبضہ جما کر انھیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہ شیطان کا گروہ ہے۔ یاد رکھو، شیطان کا گروہ ہی نامراد ہونے والا ہے۔

(سورۃ المجادلہ، آیات 16 تا 19)

اس کے برخلاف، دوسری جماعت کو نفس مطمئنہ کو پانے والی ہے، اس کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِيۡرَتَهُمۡ ؕ اُولٰٓـئِكَ كَتَبَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ وَاَيَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ ؕ وَيُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ اُولٰٓـئِكَ حِزۡبُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰهِ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۔

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، ان کو تم ایسا نہیں پاؤ گے کہ وہ ان سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے، چاہے وہ ان

کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے اور اپنی روح سے ان کی مدد کی ہے۔ اور انھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا ہے اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کا گروہ ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔ (سورۃ المجادلہ، آیت 22)

جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے پلان کے مطابق، انسان کو دنیا میں اتارا تو یوں کہیے کہ دو پارٹیاں (گروہ، جماعت) تھیں۔ ایک پارٹی کی قیادت حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھ میں تھی اور دوسری پارٹی کا جھنڈا شیطان کے پاس تھا اور وہ ان کا لیڈر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ زمین پر ایک متعین وقت کیلئے رہو، اسے آباد کرو اور میری طرف سے گاہے گاہے جو احکام آئیں، ان پر عمل کرو۔ کیوں کہ اگر ان پر عمل کرو گے تو دنیا میں امن اور راحت سے رہو گے۔ اس لیے کہ الہامی احکامات پر عمل کر کے ہی انسان اپنی دونوں ضرورتوں (جسمانی ضروریات اور روحانی ضروریات) کو پورا کر سکتا ہے۔ اور جو دونوں ضروریات پوری کرے گا، وہ دنیا میں بھی عافیت سے رہے گا اور آخرت کے بعد بھی فلاح (کامیابی) پائے گا۔

اس کے برخلاف، دوسری پارٹی کا لیڈر شیطان تھا... اس کا ایجنڈا یہ تھا کہ انسان کو صرف دنیا کے جھمیلوں میں پھنسا دیا جائے اور اسے یہ باور کرایا جائے کہ بس، جو کچھ ہے، وہ اس دنیا کی مادی اور ظاہری زندگی اور اس کی ضروریات و تعیّشات ہیں، لہٰذا اس پر مر مٹو، کافی ہے۔ اس ایجنڈے اور مشن کے ساتھ وہ آدم علیہ السلام کے ساتھ اس دنیا میں آیا اور اللہ کی مشیت سے وہ قیامت آنے تک اس دنیا میں اپنا کام کرتا رہے گا۔

بعض لوگوں نے شیطان کو خدا بنا رکھا ہے

آج حال یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کی جماعت نے اپنا خدا ہی شیطان کو بنا لیا ہے۔ چونکہ اس وقت بہ ظاہر شیطانی گروہ کے اختیار میں وسائل آ چکے ہیں، لہٰذا اس وقت آپ کو ایسے لوگ بھی بہ بانگ دہل شیطانی کارستانیوں میں مبتلا دکھائی دیں گے جو پہلے کبھی کہیں ڈھکے چھپے تھے۔ حد یہ ہے کہ اب تو ''چرچ آف شیطان'' اور اس سے ملتے جلتے ناموں سے مذاہب کی بازگشت بھی سنائی دینے لگی ہے۔

یہ گروہ نفس امارہ کیلئے جو چاہے، بن پڑے، کرنے کا خواہش مند رہتا ہے اور اپنی حد تک کرنے کی سعی بھی کرتا ہے۔ اس گروہ کے نزدیک ہر چیز جائز ہے، کیوں کہ وہ اس زَعم میں گرفتار ہے کہ ''میں خدا ہوں''۔ I am the creator. میں نے کئی جگہ یہ جملہ پڑھا ہے، آپ نے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی پڑھا ہوگا۔ اور جب، اپنے نفس کو اپنا خدا بنا لیا جائے گا تو ظاہر ہے، آپ جو کچھ کرتے پھریں، آپ کو کسی کا خوف ہوگا اور نہ ڈر۔

اس وقت مغرب مجموعی طور پر اس گروہ کا نمائندہ ہے۔ اس لیے آپ دیکھئے کہ ان ممالک میں چن چن کر وہ قوانین تشکیل اور نافذ کیے جا رہے ہیں جو نفس امارہ کو غذا دینے والے ہیں اور نفس مطمئنہ سے دور کرنے والے ہیں۔ مجھے تو بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ وہاں ایسے لوگ بیٹھے ہیں جن کا کام ہی یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے سے قرآنی حکم اور نبوی عمل کو تلاش کر کے ان کے الٹ قوانین معاشرے میں پروان چڑھائے جائیں تاکہ حزب الشیطان مضبوط ہو۔ مثال کے طور پر، اس کی بہت نمایاں مثال جنس ہے۔ کئی مغربی ممالک میں ایک سے زائد نکاح پر پابندی ہے جبکہ نکاح کے بغیر آپ محض ذاتی رضامندی سے جتنے چاہے گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ رکھیں، جس سے چاہیں، جب چاہیں ملیں، آپ پر کوئی قانونی قدغن عائد نہیں ہوگی۔ اب تو حد یہ ہے کہ انسانی فطرت کے نام پر ہم جنس پرستی اور

ہم جنس شادی کی بھی قانونی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ آزادی اور انسانی حقوق کے نام پر ہو رہا ہے۔

کبھی تحقیق کے نام پر تو کبھی انسانیت کے نام پر پوری دنیا میں یہ کھیل جاری ہے۔ ایسا نہیں کہ ان لوگوں کو علم نہیں کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ خود اُن کی تحقیق اور علم کے خلاف ہے، مگر یہ لوگ سورۃ النمل (آیت 14) کی اس آیت کی عملی تفسیر ہیں کہ

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ

ترجمہ: اور اگر چہ اُن کے دلوں کا ان (کی سچائی) کا یقین ہو چکا تھا، مگر انھوں نے تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کیا۔ (سورۃ النمل،14)

چنانچہ جو لوگ کفر کرتے ہیں اور اللہ کی آیتوں اور احکام کے خلاف کرتے ہیں، ایسا نہیں کہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ حق کیا ہے، بلکہ اندر خانہ اپنے دل سے یقین کرنے کے باجود کہ یہ سب حق اور سچ ہے، اپنے ظلم اور تکبر کی وجہ سے اللہ کے احکام پر عمل کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ جیسے آں حضرت ﷺ کے زمانے میں ایک کافر نے ابوجہل سے پوچھا کہ کیا تم یہ مانتے ہو کہ محمد (ﷺ) واقعی اللہ کے رسول ہیں؟ تو ابوجہل نے یہ تسلیم کیا کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہی درست ہے۔ لیکن اس نے دل میں یہ تسلیم کرنے کے باوجود عملی اور ظاہری طور پر، اس دعوتِ حق کا انکار کیا۔

کیوں؟

اس لیے کہ اگر ابوجہل اگر آں حضرت ﷺ کو نبی مان لیتا تو اُس کا متکبرانہ مقام ختم ہو جاتا اور سرداری قربان کرنا پڑتی۔ ایسے ہی جو لوگ خواہ کتنے ہی تعلیم یافتہ اور تحقیق داں ہوں، اگر اپنی تحقیقات کے نتائج کے برخلاف، محض اپنی دنیاوی اغراض اور نفسانی خواہشات کی وجہ سے حق کو ماننے سے انکاری ہیں اور الٰہی تعلیمات کے خلاف کر رہے ہیں تو وہ بھی ابوجہل کی طرح حزب الشیطان میں شامل ہیں۔

اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ یہ نہ دیکھئے کہ wrapping کیسی ہے، یہ بھی دیکھئے کہ اس کا منبع (Source) کیا ہے۔

ایسے میں وہ لوگ زیادہ خطرے میں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو اللہ کے نام سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن، اگر غلط کام اللہ کے نام سے شروع کیا جائے تو کیا وہ جائز ہو جائے گا۔ یہ تو خود کو بہت بڑا دھوکا ہے۔ یہ دھوکے ہیں کہ علامت نہیں بنا رہے ہیں، قرآن کی آیت لے لیتے ہیں۔ پھر، جب ہمارے پاس متبادل موجود ہے تو حرام کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر میرے پاس انرجی ہیلنگ کا متبادل رقیہ کی صورت میں ہے تو مجھے مروج متبادل توانائی کے طریق علاج کی طرف کیوں جائیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہوا کہ سردی سے بچنے کیلئے ہمارے پاس ہیٹر ہے، وغیرہ وغیرہ، لیکن شراب اس لیے پی جائے کہ اس سے بدن کی حرارت بڑھے گی۔

یاد رکھیں، کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اس کام کی ''نیت'' بہت اہم ہے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ''کیوں'' کر رہے ہیں۔ اگر کام کی نیت واضح یا درست نہیں تو وہ کام بہ ظاہر کتنا ہی اچھا لگتا ہو، وہ جائز اور درست نہیں ہو سکتا۔ ہماری روزمرہ زندگی میں اس کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ ایک کام صرف نیت کے غلط ہونے پر غلط ہو جاتا ہے تو وہی کام نیت کے درست ہونے کی وجہ سے درست، جائز اور قانونی مانا جاتا ہے۔

آج یہ فتنہ بہت عام ہو چکا ہے کہ لوگ غیر قرآنی تصورات کو ''قرآنی فکر'' کہہ کر عام کرتے ہیں۔ کیا قرآن کے غلاف میں قرآن کے سوا کوئی اور کتاب رکھ دی جائے تو کیا وہ قرآن کی طرح معتبر اور مستند ہو جائے گی؟ یقیناً نہیں! یاد رکھیے، کسی شے کے معتبر اور مستند ہونے کا تعلق اس کے مواد اور سیاق اور منبع سے ہے۔ اگر خنزیر کو تکبیر کہہ کر ذبح کیا جائے گا تو کیا اس کا ذبیحہ جائز ہو سکتا ہے؟ قطعاً نہیں، کبھی نہیں، ہرگز نہیں!

میں بعض اوقات غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کبھی کوئی دَور گزرا ہو، کسی

بھی علاقے کی بات ہو، غلط لوگوں کا طرزِ عمل یکساں رہا ہے اور نیک لوگوں کے اعمال ایک جیسے رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی حقیقت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مادی یا جسمانی ضروریات کی تکمیل اور روحانی ضروریات کی تکمیل کا لائحہ عمل بہت واضح اور سادہ رکھا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی سے انسانی ضروریات نہیں بدلیں

غور کیجیے کہ ایک جانب حضرت آدم علیہ والسلام کا دور اور اس زمانے کی زندگی... اور آج اکیسویں صدی کے جدید ترین ٹکنالوجی... عمومی خیال یہی ہے کہ آج کی انسانی ضروریات گزشتہ زمانوں کی انسانی ضروریات سے مختلف ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی جسمانی ضروریات ہوں یا روحانی ضروریات، سب آج بھی وہی ہیں جو ہزاروں برس پہلے کے انسان کی تھیں۔ اصل فرق رہن سہن میں آیا ہے، ضروریات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ بات ہمیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قولِ مبارک سے بھی ملتی ہے۔

وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم نَتَذَا کَرُمَا یَکُوْنُ اِذْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلِ زَالَ عَنْ مَکَانِہٖ فَصَدِّقُوْہُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلِ تَغَیَّرَ عَنْ خُلُقِہٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِہٖ فَاِنَّہ، یَصِیْرُ اِلٰی مَا جُبِلَ عَلَیْہِ۔

حضرت ابودرداء فرماتے ہیں، ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ وقوع پذیر ہونے والی باتوں پر گفتگو کر رہے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا: ''جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا ہے تو اسے سچ مان لو، لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی آدمی کی فطرت بدل گئی ہے تو اس کا عتبار نہ کرو۔ اس لیے کہ انسان اسی چیز کی طرف جاتا ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔'' (مسند احمد بن حنبل)

اس بات کو آپ کو یوں سمجھئے کہ پہلے انسان پتھر سے آگ جلایا کرتا تھا، آج گیس کے چولھے موجود ہیں۔ لیکن، کھانا سب کو وہی کھانا ہوتا ہے جو اس کے جسم کو توانائی دے۔ ایسے ہی پہلے لوگ جسم کو گرمائش پہنچانے کیلئے جانوروں کی کھال اوڑھا کرتے تھے اور اب ہم جدید ٹکنالوجی سے تیار کردہ لباس پہن لیتے ہیں۔ اپنی حفاظت کیلئے پہلے لوگ غاروں میں گھر بنایا کرتے تھے، آج کا جدید انسان سوسائٹیاں قائم کرتا ہے تا کہ ایک مخصوص حدود کے اندر رہ کر حیوانوں اور لٹیروں سے اپنا تحفظ کر سکے۔ اس لیے ٹکنالوجی سے لائف اسٹائل تو بدلا جا سکتا ہے، انسانی ضرورت وہی ہے جو پہلے تھی۔ یہی ''فطرت'' ہے۔

توحید اور انسانی فطرت

انسان جس ڈھب پر بنایا گیا ہے، اس کے تحت انسان اپنے گرد موجود مادی دنیا (Materialistic World) کے ظاہری چکروں میں پھنس گیا اور دھوکا کھا گیا کہ بس جو کچھ ہے، یہی ہے کہ جو اسے دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ اس کا ایک اور وجود بھی ہے... روحانی وجود... لیکن وہ اسے بھول گیا۔ چنانچہ انسان کو جو بھی اپنے سے زیادہ طاقت وَر شے دکھائی دی یا جس سے اسے فائدہ محسوس ہوا، وہ یہ سمجھنے لگا کہ یہی خدا ہے۔ اس لیے انسان سے پے در پے کئی خدا بنا ڈالے۔

ایسے میں انسان یہ بھول گیا کہ یہ تمام چیزیں جو بہ ظاہر اس سے زیادہ طاقت ور دکھائی دیتی ہیں، وہ اس سے کم زور اور اُس کی دست رَس میں ہیں۔ لیکن، انسان اس تہ تک نہ پہنچ سکا۔ حد یہ ہوئی کہ انسان نے انتہائی حقیر حیوانات و حشرات اور جمادات تک کو اپنا خدا بنا لیا۔ آج بھی دنیا کے بعض خطوں میں ایسے قبائل مل جائیں گے جہاں مختلف پالتو یا جنگلی جانوروں کی پرستش کی جاتی ہے یا پھر مظاہر قدرت جیسے آگ یا پانی کی پوجا پاٹ عام ہے۔ اسے ''شرک'' کہا جاتا ہے۔ شرک کیا ہے؟ اپنے حقیقی خالق کہ جس نے انسان کو تخلیق

کیا ہے، کے مقابلے میں کسی اور کو اس کی خلاقیت میں شریک کرلیا جائے۔ ایسے ہی اپنے حقیقی اور واحد پالنے والے (رب) کے ساتھ ساتھ یہ گمان کیا جائے کہ اردگرد موجود چیزیں یا افراد بھی اس کے کفیل ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اردگرد جتنی چیزیں ہیں، خواہ زمین پر ہیں یا زمین سے ورا، سب کی سب انسان کی خدمت کیلئے پیدا کی گئی ہیں، انسان کو فائدہ دینے کیلئے بنائی گئی ہیں، وہ بہ راہِ راست اور بہ ذاتِ خود انسان کو نفع نہیں دے سکتیں۔ انسان چونکہ ظاہر پرست واقع ہوا ہے، لہٰذا اس نے یہ دیکھا کہ اسے جن جن چیزوں سے فائدہ مل رہا ہے، وہی اس کی خالق ہوسکتی ہیں۔ لیکن، یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

جو آدمی اللہ کے سوا کسی اور سے کچھ ہونے کا یقین رکھتا ہے، خواہ وہ حیوانات ہوں، جمادات ہوں یا پھر خود انسان ہوں... وہ اُس کی سب سے بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔ قرآن کی رُو سے یہی شرک ہے اور اسے "عظیم ظلم" قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ

ترجمہ: بے شک، شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

قرآن کریم میں یہ تک واضح طور پر ارشاد ہے کہ توحید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ واضح فرماتے ہیں:

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

ترجمہ: لہٰذا، تم یک سُو ہوکر اپنا رخ اس دین کی طرف قائم رکھو۔ اللہ کی بنائی ہوئی اُس فطرت پر چلو جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ یہی بالکل سیدھا راستہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۃ الروم، 30)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیسے انسان اپنی فطرت کے خلاف کچھ کرے گا تو وہ پریشان ہوگا، ایسے ہی غیر مسلم لوگوں کی پریشانیوں بلکہ بے اطمینانی کا سب سے بڑا سبب توحید کی

فطرت پر نہ ہونا قرار دیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے گاہے گاہے دنیا میں انسان کی اس بھول کو مٹانے کیلئے انبیا اور رسول بھیجے جنھوں نے انسان کو یہ بتایا کہ وہ مادی وجود کی ضرویات کے ساتھ ساتھ اپنے پوشیدہ روحانی وجود پر بھی غور کرے اور اس کی ضروریات کیلئے بھی وقت نکالے۔

اپنے موضوع کی بات کروں تو ماہرین نفسیات کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ انھوں نے جو کام بھی کیا، اس میں سے توحید کو نکال کر غور وخوض کیا۔ جب کسی شے کی بنیاد ہی غلط ہو تو بھلا عمارت کیسے سیدھی تعمیر ہوسکتی ہے؟

یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جو لوگ کافر ہیں، وہ کچھ بھی کرگزریں، کتنے ہی نیک اور بااخلاق ہوجائیں، وہ روحانی سکون اور راحت کے مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکتے... کہ جس مقام پر ادنیٰ سے ادنیٰ موحد (اللہ کو واحد اور ایک ماننے والا) بھی موجود ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ بات آپ کو ماننی پڑے گی کہ انسان کتنی ہی ترقی کرجائے، اس کی بنیادی انسانی ضروریات... خواہ وہ جسمانی ضروریات ہوں یا روحانی ضروریات... وہ ہمیشہ سے ایک جیسی رہی ہیں اور قیامت تک ایسی ہی رہیں گی۔ یہ انسان کے خالق کا اس پر بہت بڑا احسان ہے جس کا ادراک اکثر کو نہیں ہوتا۔ جس آدمی کے اندر یہ احساس پیدا ہوجائے اور وہ اپنے رب کی قدردانی کرنے لگے تو سمجھئے کہ وہ نفس مطمئنہ کے ایک درجے پر پہنچ گیا۔